تماشہ

شاہنواز زیدی

تماشا

شاہنواز زیدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ۔

نام کتاب:	تماشا
مصنف:	حسن شاہنواز زیدیؔ
اشاعتِ اوّل:	۲۰۱۴ء
طابع:	پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور پاکستان
تعداد:	۵۰۰
قیمت:	۳۰۰ روپے بیرونِ ملک 5 ڈالر

ISBN: 978-969-93-25-14-4

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
غالبؔ

اپنی ادھوری محبتوں کے نام!

فہرست

1	شاہنواز۔فن کے وجدان کا شاعر	1
2	نعت	11
3	سلام	13
4	دل بھی داغِ نقشِ کہن سے بجھا ہوا تھا	15
5	ایک اور شام	18
6	اس کی آنکھوں میں محبت کا گماں تک نہیں آج	22
7	کسی بنجر تخیل پر، کسی بے آب رستے میں	24
8	دکھائی دے مجھے!	26
9	ابھی وہیں پہ رکی کھڑی ہیں ہوا میں باتیں	28
10	جو ہزار چاند لگائیں گے، اسی دھول میں اسی خاک میں	30
11	دریچہ آئینے پر کُھل رہا ہے	32
12	کہاں جاتے ہو میاں، کچھ تو خبر دے سکو ہو	34
13	زبانِ غیر (رنکو ڈتہ کی نذر)	36
14	تری تخلیق، ترا رنگ حوالہ تھا مرا	39
15	کچھ دیر تو ایمان کی راہوں پہ چلا میں	41
16	یہ کائنات کہاں، خاکِ ارضِ فانی کہاں	43
17	تعلیم یافتہ	46
18	محبت	49
19	مرے خدا کوئی چھاؤں، کوئی زمیں، کوئی گھر	52
20	دل ملا ہے وہ کہ دشمن ہے ہر اک تدبیر کا	54
21	تم گزر رو اور وقت نہ ٹھہرے، ایسا تھوڑا ہو سکتا ہے	56
22	ہسٹریا	58
23	ایک منظر	62

24	آنکھ پھر تیرے خواب سے بھرلوں	64
25	کاغذی ساتھ	66
26	جہاں گلدان گلابوں سے سجایا ہوا ہے	68
27	الجھا اس کی دید میں	71
28	ہنسنا منع ہے (اپنی ایک پینٹنگ)	74
29	آؤ پھر مل جائیں سب باتیں پرانی چھوڑ کر	76
30	ٹائم مشین	78
31	اب کے دو سو ساٹھ مرے ہیں	82
32	خطرہ گھر تک آپہنچا ہے	84
33	عظیم مذہب یہ فیصلہ کر	87
34	برگِ گل کی مثل مرجھایا ہوا	90
35	ایک امریکی فوجی کا خط	92
36	بھونچال	96
37	ہم لوگ	101
38	زلزلہ	103
39	اہلِ غرض ہیں لوگ سب، شہر کے ہوں یا گاؤں کے	105
40	پہلے جیسا نہیں رہا ہوں	107
41	تجدیدِ وفا	109
42	عرضِ حال	112
43	صفِ اوّل میں یا اربابِ ثانی میں نہیں ہے	114
44	میں کچھ بھی نہیں	116
45	میز پہ چہرا، زلفیں کاغذ پر	118
46	چھوٹی سی بات	121
47	شانتی نگر کی راکھ سے (جوسلین سعید کی نذر)	123
48	ہر کسی خواب کے چہرے پہ لکھوں نام ترا	125

49	کوئی تبدیل ہوا	127
50	روشن آئینوں میں جھوٹے عکس اتار گیا	130
51	آج آئینے میں چہرا ہی نہ تھا	132
52	میراث (اپنے والد کی رحلت پر)	135
53	الوداع	138
54	چندا ماما	140
55	ایک اور منظر	143
56	جب آفتاب سے چہرا چھپا رہی تھی ہوا	144
57	خواب کا سائبان دینا پڑا	146
58	پگھلا ہوا چاند	148
59	احمد ندیم قاسمی	149
60	گلزار	151
61	سبھی راستے ترے نام کے، سبھی فاصلے ترے نام کے	154
62	ایک مانوس نام تھا، کیا تھا	156
63	ایک تصویر	158
64	خالد اقبال	161
65	پروفیسر پرویز وِنڈل کے لیے ایک نظم	163
66	استاد شوکت حسین خان کے لیے ایک نظم	165
67	عملِ چغتائی	168
68	منصورہ احمد	175
69	اعجاز الحسن	179
70	نقش بر قالین (رخ نیلوفر کی مصوری سے متاثر ہو کر)	182
71	محبت سے تری یادیں جگا کر سو رہا ہوں	185
72	دیکھنا جب دار سے عیسیٰ اتارا جائے گا	187
73	اب کے موضوع بدلنا ہوگا	189

74	آخری تصویر	191
75	مرے آئینے کو عزیز رکھ، تنِ ریزہ ریزہ قبول کر	192
76	شاخِ ہوا کے ساتھ لرزتا، پھر وہی رستہ	194
77	سورج تری دہلیز میں اٹکا ہوا نکلا	196
78	مصرعے کے وسط میں کھڑا ہوں	198
79	نقوشِ پا، لکیریں، زاویے، اچھے نہیں لگتے	200
80	انگیٹھی	202
81	وہی آنکھوں میں پوشیدہ اشارے سے، وہی باتوں میں چوخانے معموں کے	203
82	پھر یوں ہوا کہ گھر میں دھواں پھیلنے لگا	205
83	کسی پہلے سے بتائے ہوئے رستے پہ چلوں	208
84	افسوس غمِ یار سے مہلت مجھے تھی	210
85	ہیں خواب میں ہنوز	212
86	غزل کو مسترد دیکھا، سخن کو بے اثر پایا	214
87	محبت کی سمجھ مشکل سے آتی ہے	216
88	رکتے رکتے جنوں ہو گیا	219
89	ترے خیال میں بیٹھوں تو کچھ سمجھ آئے	221
90	محبت کیا ہے	223
91	دل نہ ملتے ہوں تو پھر عید یا بقر عید بھی کیا	226
92	مجھے لکھنا نہیں آتا، تمہیں پڑھنا نہیں آتا	228
93	زین کے لیے	230
94	شکستِ شیشۂ دل کی دوا میں کیا کرتا	232
95	اُسے سر کرنے کا سودا تھا، محبت کسے تھی	234
96	املتاس	236
97	پنجابی کافی	238

شاہنواز۔ فن کے وجدان کا شاعر

شاہنواز کے شعری مجموعے کا مسودہ میرے سامنے رکھا ہے۔اس کی خواہش ہے کہ میں ان تخلیقات پر کچھ اظہارِ خیال کروں اور میں اپنی کم مائیگی پر شرمندہ ہوں۔

یہ نہیں کہ میری اس سے ملاقات نئی ہے یا میں اس کے فن سے بے خبر ہوں۔جی نہیں۔میں تو اسے تب سے جانتی ہوں جب مجھے اپنے ہونے کی خبر بھی نہیں تھی۔مگر اس کی شخصیت اتنی ہمہ جہت ہے اور پھر وہ اتنے لوگوں کی نظر میں ہے کہ میرا لکھا ہوا کوئی بھی لفظ اور میری کہی ہوئی کوئی بھی بات اس کی شخصیت اور تخلیقات کے ضمن میں کسی اضافے کا باعث نہیں ہو سکتی۔

لیکن پھر بھی اس کی یہ خواہش ہے اور میرا اعزاز۔

اردو کے قاری کے لیے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ شاہنواز زمصور ہے، شاعر ہے، گلوکار ہے، اداکار ہے۔ فنون لطیفہ کا حسی ادراک اسے قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا جسے اس نے نہ صرف اپنی شعوری کاوش اور محنت سے سنوارا بلکہ اپنے فن کو وسیلۂ روزگار بنا کر غمِ دوراں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوا حصول عشق میں کامیاب ہوا۔ وہ فنون لطیفہ کے درِ دولت کا رضواں ٹھہرا اور اس نے اپنے سینکڑوں شاگردوں کو رنگوں، تصویروں اور ساز وآواز کی جنت میں داخلہ کا پروانہ عطا کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہزارہا مجھ جیسے بھی اس سے مسحور ہیں جو صرف وجدان کی راہ سے فنون لطیفہ کے دائرۂ سحر میں داخل ہوتے ہیں۔

یہ مختصر سا تعارف بھی اس کے جاننے والوں کے لیے ضروری تو نہیں تھا مگر مجھے اس کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنا ہے اور اس تمہید کے بغیر میں ترسیل سے قاصر ہوں کیونکہ میرے خیال میں جیسے کائنات کے سارے دیکھے ان دیکھے اجزاء کڑیوں کی مانند ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہیں اسی طرح سچا تخلیق کار بھی ایک کُل ہوتا ہے۔ اور اس کی تخلیق کے کسی بھی پہلو کو اس کُل کے پس منظر میں رکھے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔ اور پھر شاہنوار جیسی تہہ دار شخصیت کا تخلیق کار......! ایک عجیب اسرار اس کی تہہ در تہہ شخصیت کے ہر پرت میں موجود ہے۔ لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اس میں کوئی فریب والی بات نہیں۔ بس اسے جاننے کے لیے ذرا اندر کی آنکھ سے اندر تک دیکھنا پڑتا ہے اور پھر بڑی آسانی سے یہ پرت کھلتے جائیں گے اور مزید یہ کہ ہر پرت کے بیچ آپ کی آسانی کے لیے معصومیت کی چاندی کا ایک ورق بھی رکھا ہے۔

ہاں تو میں بات کررہی تھی کُل اور اجزاء کے رابطے کی۔ تخلیق کار اور اس کی ہمہ جہت تخلیقات کے آپسی رشتے کی۔ اصل میں میں شاہنواز کی بات کررہی تھی اور وہ بھی اس کی شاعری کی۔ تو یوں ہے کہ جب میں اس کی شاعری کو دیکھتی ہوں تو اس میں موسیقی، موسیقی میں رنگ اور رنگوں میں بھیگا ہوا اس کا تن من نظر آتا ہے۔ یہ سب دیکھ کر مجھے شمالی خطّوں کی خزاں یاد آتی ہے جو پوری فضا میں رنگوں کی ایسی ہولی کھیلتی ہے کہ دیکھ کر اندر باہر سب رنگ جاتا ہے۔ آنکھوں سے پینا اور پھر رگ رگ میں اتار لینا کیا ہوتا ہے۔ اسی تجربے نے مجھے سمجھایا۔ خزاں کے چمکیلے زرد، نارنجی، آتشیں، سرخ، کتھئی رنگ اور ان سب پر خزاں کی اداسی کی چپ چاپ پڑتی سرمئی پھوار کا رنگ۔

شاہنواز کی شاعری میں بھی یہ سب رنگ ہیں اور ان پر اداسی کی پھوار آہستہ آہستہ پڑتی ہے۔ اس کی ساری غزلیں، ساری نظمیں، سارے شعر اپنے اندر سکوت کا ایک خاموش سُر لیے آہستہ آہستہ نرمی سے دل کی زمین پر اترتے ہیں۔

آنکھیں موند کے دیکھوں تو شاہنواز اور اس کے فن کا تصور یوں تصویر میں ڈھلتا ہے جیسے کسی خاموش جنگل میں ایک گہری ساکت جھیل اور اس پر جھکی ہوئی ست رنگی قوسِ قزح کا جھل مل کرتا عکس۔

اس جھیل کی گہرائی اور اس کے سکوت کا کتنوں کو تجربہ ہوا، یہ تو میں نہیں کہہ سکتی مگر اس کے ست رنگے فن کی قوسِ قزح اور اس کا جھل مل کرتا عکس تو ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے۔

آیئے دیکھیں کہ جب یہ عکس شعر میں ڈھلتا ہے تو سرگم کے لیے کیسے سر، نرت کے کون سے بھاؤ، تصویروں کے کیا کیا خطوط اور رنگوں کی کیسی کیسی چھوٹ حرف واظہار کے

حصہ میں آتی ہے۔

کھلتا جاتا ہے گریبانِ فلک
شاید اب چاند نکلنا ہوگا

شام کی راہ کا گل رنگ غبار
صبح کے ہاتھ پہ ملنا ہوگا

جس طرح رنگِ شفق جھیل میں گھل جاتا ہے
عکسِ لب ایسے اترتا ہے تہہِ جام ترا

دامن پہ پھول بھی نہ لہو سے بنا سکے
آنکھوں پہ اختیار ہی باقی نہیں رہا

کیا بات چھیڑی ہوا نے
تالاب ہنسنے لگا ہے
بارش برسنے لگی ہے
پانی کی چادر کے اوپر
بوندوں کی کیلیں گڑی ہیں

دل پہ اترا شام کا زرّیں ورق
ضربتِ ساعت سے پھیلایا ہوا

شاہنواز اداکار بھی ہے۔اس کے ہاں سٹیج پر کرداروں کی موجودگی کا احساس فطری ہے۔ یہ ڈرامائی عنصر اور متحرک کردار اس کے ہاں شعر کے روپ میں ڈھلتے ہیں تو پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اکیلا ٹوٹی کشتی پر کھڑا ہوں
کنارا دور ہوتا جارہا ہے

اب سنسان گلی میں سایہ تک موجود نہیں
آدھی رات کے سناٹے میں کون پکار گیا

اس کے ہاں ہجر کے بڑے نازک تجربے ہیں:

روشن آئینوں میں جھوٹے عکس اتار گیا
کیسا خواب تھا ، میری ساری عمر گزار گیا

تتلیاں پھول میں کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں سدا
کیا کہیں بادِ صبا رکھ گئی پیغام ترا

سحر ہوتے ہی جیسے ریت بھر جاتی ہے آنکھوں میں
نسیمِ ہجر تیرے ذائقے اچھے نہیں لگتے

کہیں اندر ہی ٹوٹے ہونگے الفاظ
ابھی تک تیرا لہجہ چبھ رہا ہے

میرے خیال میں وہ اپنے آپ میں اپنے آپ سے مہجور ہے اس لیے وصل کے ہر امکان کو وہ خود رد کرتا ہے اور اس کے لیے طرح طرح کے حیلے تراشتا ہے۔ دل کا معاملہ عقل کے حوالے سے طے کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ حرکت کرتے ہوئے کبھی کبھی پکڑا بھی جاتا ہے:

دوست مرا کیوں ساتھ نبھاتے
جب میں اُن کو چھوڑ چکا ہوں

اس کو ایک غزل پہنچانی تھی جلدی میں
لیکن رستے میں سناٹا کھڑا ہوا تھا

میری بات پر یقین نہ ہو تو اس کی نظمیں، ''تجدید وفا''، ''چھوٹی سی بات'' اور ''ایک شام'' پڑھ لیجیے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے محبت کے تجربے کا ادراک نہیں۔ نظم 'محبت' اس تجربے کا بہت ہی بلیغ اشارہ ہے۔

شاہنواز کی شاعری میں زندگی کے ہشت پہلو تجربے جگہ جگہ فطرت کے وسیع تناظر میں اظہار پا رہے ہیں جو اس کے ہاں اجزا کے اپنے کُل سے مثبت رابطے کا ثبوت ہیں۔ مثلاً:

کہسار بھاگنے لگے بادل سمیٹ کر
پانی زمیں کی قید سے آزاد ہوگیا

اس امید میں گھاس پہ لیٹا ہوں
کوئی ستارا دے گا تری خبر

تم جہاں ہو وہاں خورشید بھی ٹھہرا ہوا ہے
اب تمھی اس شبِ فرقت کو سحر دے سکو ہو

مرے سینے کے آسمان کے بیچ
وہ جو ماہِ تمام تھا ، کیا تھا

میں اس کو روتا ہوا دیکھتا رہا چپ چاپ
چنبیلی گھاس پہ ٹپ ٹپ گرا رہی تھی ہوا
تمام عمر میں سمجھا، ہوا مخالف ہے
مرے چراغ میں خود کو جلا رہی تھی ہوا

فطرت کے حسن میں گندھی ہوئی شاعری کی بہترین مثالیں اس کی نظم میں بھی موجود ہیں۔مثلاً 'معجزہ'، 'ایک منظر'، 'پگھلا ہوا چاند' وغیرہ۔

ایک اور وصف جو زبان و بیان پر مکمل دسترس کے بغیر شعری اظہار میں ممکن نہیں، سہل ممتنع کی خصوصیت ہے۔شاہنواز کے اظہار میں پانی کی سی روانی ہے۔لفظ اور خیال دونوں بغیر کسی اڑچن کے اظہار سے ترسیل تک بہتے چلے آتے ہیں۔ اور چھوٹی بحر میں تو یہ خصوصیت اور بھی نمایاں ہوگئی ہے۔

پہلے جیسا نہیں رہا ہوں
میں اندر تک ٹوٹ گیا ہوں
تصویروں کا قحط پڑا ہے
اور میں رنگ گنوا بیٹھا ہوں

یا پھر

خطرہ گھر تک آپہنچا ہے
پانی سر تک آپہنچا ہے
اعتبار اٹھتا جاتا ہے
شک اندر تک آ پہنچا ہے

مندرجہ بالا انفرادی شعری تجربات کے ساتھ ساتھ شاہنواز کے ہاں اجتماعی معاشرتی ناہمواریوں کا احساس شدت سے موجود ہے۔ ان موضوعات کے اظہار کے لیے اس نے نظم کے مادیم سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس کی نظم 'کاغذی ساتھ' معاشرتی قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے جذبوں کی موت کا نوحہ ہے۔ اس نوحے کی گونج اس کی غزل تک بھی آ پہنچی ہے:

مرے خدا کوئی چھاؤں، کوئی زمیں، کوئی گھر
ہمارے جیسوں کی قسمت میں کیوں نہیں کوئی گھر
مکان بننے سے کوئی جگہ بچی ہی نہیں
ہوا تو کرتا تھا پہلے کہیں کہیں کوئی گھر

'ہنسا منع ہے'، حقوقِ نسواں کے استحصال کی ایک بڑی کامیاب نظم ہے۔
'ہسٹریا' پدرسری نظام کی جکڑ بندیوں میں پیوست نسوانی کیفیات کے الجھاؤ کے گہرے ادراک پر مبنی ہے۔ میرے خیال میں اسے موضوع کے اعتبار سے اردو کی بہترین نظموں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ایک اور نظم ''عرض حال'' بھی ایک بڑے عجیب تجربے کی نظم ہے۔ جس میں شاعر ماضی اور مستقبل کو حال کے نقطہ پر لا کر کبھی جمع کرتا ہے اور کبھی

تفریق۔ یہ وقت کے تسلسل کے حوالے سے معاشرتی اور زمانی حدود کو عبور کرتی ہوئی نظم ہے۔

ایسے ہی مضامین اس کی غزل میں بھی موجود ہیں:۔

چہروں کو پیروں سے کچل کر آگے بڑھ جانا
جیت اسی کو کہتے ہیں تو پھر میں ہار گیا

یہ کلام اللہ کب ہے جو سدا باقی رہے
دارِ فانی سے چلے ہیں نقشِ فانی چھوڑ کر

ابھی وہیں پر رکی کھڑی ہیں ہوا میں باتیں
چلو چلیں، پھر جہاں پہ تھیں ابتدا میں باتیں

خود ان کے خالق انہیں کبھی کا بھلا چکے ہیں
بھٹکتی روحیں ہیں کوچۂ بے نوا میں باتیں

اس کی نظمیں 'ٹائم مشین' اور 'اب کے دو سو ساٹھ مرے ہیں' اس ظلم کے خلاف پرزور احتجاج ہیں جو جنگ و جدل اور قتل و غارت گری کی شکل میں نوعِ انسانی پر ٹوٹ رہا ہے۔

اپنے ہمعصر فنکاروں کے بارے میں اس کی نظمیں انتہائی پراثر خراج تحسین ہیں جن میں گلزار، احمد ندیم قاسمی، منصورہ احمد، استاد شوکت حسین، خالد اقبال، اعجاز الحسن اور نیلوفر شامل ہیں۔ ان نظموں میں اس کا کرافٹ خاص طور پر نمایاں ہے۔

آخر میں میں اس کی جس نظم کا خاص طور پر حوالہ دینا چاہتی ہوں، وہ 'ایک امریکی فوجی کا خط' ہے۔ حصولِ امن عالم کے سلسلے میں میری ادبی شعری نثری اور ذاتی کاوشوں کے سفر میں مجھے لگتا ہے کہ شاہنواز بھی میرا ہمسفر ہے کہ وہ رنگ و نسل و مذہب اور ملت کی حد بندیوں سے اوپر اٹھ کر پوری نوعِ انسانی کے دکھ کو محسوس کرتا ہے اور نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اس کا تخلیقی اظہار بھی کرتا ہے اور میں، جو ادب کو زندگی کے دھارے کو مثبت سمت میں موڑنے اور شعور پیدا کرنے کا وسیلہ سمجھتی ہوں، اس کی شعور گری کی اس کوشش پر نہ صرف اس کو بلکہ کاروانِ ادب کے تمام مشعل برداروں کو مبارک باد پیش کرنا چاہتی ہوں، جو معاشرتی جور و ستم کے اندھیروں میں اور مادہ پرستی کے نقلی سورج کی اندھا کر دینے والی تابکار شعاؤں کی یورش کے باوجود نہ صرف اپنا راستہ امن و سلامتی کی منزل کی جانب کھوج رہے ہیں بلکہ معصوم عوام میں اس شعور کی افزائش کی کوشش میں بھی مشغول ہیں۔

نزہت صدیقی

ٹورانٹو۔کینیڈا

نعت

درود پڑھیے، مرے نبیؐ پر درود پڑھیے
پھر اُس مجسم سلامتی پر درود پڑھیے

سلام کیجیے ، صعوبتوں کو ، محبتوں کو
ہر ایک دشمن سے دوستی پر درود پڑھیے

نگاہِ حق میں جو پیشِ تخلیق اولیں تھا
اُس آخر الزمان آدمی پر درود پڑھیے

کبھی جو محتاجِ درس و مکتب نہیں رہا ہو
اُس علم و عرفان و آگہی پر درود پڑھیئے

اندھیرا بن کر اگر تعصب نظر کو گھیرے
تو دونوں عالم کی روشنی پر درود پڑھیئے

اگر لگے کہ ہدایتوں پر عمل ہے مشکل
قرآن تفسیر زندگی پر درود پڑھیئے

صداقتِ اہلِ بیتؑ کا اعتراف کیجے
تمدنِ کعبۂ نبیؐ پر درود پڑھیئے

نہیں رہا کوئی اونچا نیچا، پرایا، اپنا
خیالِ وحدت کی سادگی پر درود پڑھیئے

کہاں وہ محبوبِ کبریا اور کہاں مرا دل
حضورؐ کی بندہ پروری پر درود پڑھیئے

سلام

حسینؑ تیرے حضور میں سر جھکا رہا ہوں سلام لکھ کر
میں بے عمل ہوں، عمل سے دامن بچا رہا ہوں سلام لکھ کر

تُو کارزارِ حیات میں شرحِ ذبحِ عظیم بن کے آ گیا ہے
میں کاغذی مشعلوں میں آنسو جلا رہا ہوں سلام لکھ کر

تو سارے دشتِ وفا کو اپنے لہو سے رنگین کر گیا ہے
میں اپنے گُل ہائے بے حقیقت سجا رہا ہوں سلام لکھ کر

وہ تیرا رستہ کہاں تھا جس کی تلاش میں کوبہ کو پھرا ہوں
وہ تیرا دروازہ کب تھا جس پر کھڑا رہا ہوں سلام لکھ کر

بہت ترا اتباع مشکل ہے، سہل ہے کس قدر ترا غم
سو میں صفِ ماتمِ تکلم بچھا رہا ہوں سلام لکھ کر

یہ کونسا آسماں ہے جس پر مجھے مری سوچ لے چلی ہے
یہ نام کس کا ہے جس سے نسبت بنا رہا ہوں سلام لکھ کر

مجھے یہ تحریر لے نہ جائے کہیں ترے سخت راستے پر
میں دیر تک اپنی فکر میں مبتلا رہا ہوں سلام لکھ کر

وہاں کوئی تیغ و مشک تھامے فرات میں تشنہ لب کھڑا ہے
یہاں میں دریاؤں میں عریضے بہا رہا ہوں سلام لکھ کر

اگرچہ جھولی بھری ہوئی ہے، مگر ہے دستِ سوال خالی
کرم ہو مولا، میں اپنی منت بڑھا رہا ہوں سلام لکھ کر

○

غزل

دل بھی داغِ نقشِ کہن سے بجھا ہوا تھا
چاند کے گرد بھی اک ہالہ سا بنا ہوا تھا

اس کو ایک غزل پہنچانی تھی جلدی میں
لیکن رستے میں سناٹا کھڑا ہوا تھا

شعلہ چوم کے رکھے اس نے سانس دیئے میں
میں نے جھک کر دیکھا، کاجل بہا ہوا تھا

چھت سے چہرے پر گرتے ہی رہے ستارے
آسمان کا خیمہ تھوڑا پھٹا ہوا تھا

بستی سے نکلے ہیں کچھ مٹی کے کھلونے
انسانوں کا نام و نشاں تک مٹا ہوا تھا

ہاتھ باندھ کر میرے سارے عدو کھڑے تھے
لیکن میں اپنی تخریب پہ تلا ہوا تھا

مشک بھری ہے میں نے دونوں ہاتھوں کٹا کر
سوچوں کے پانی پر پہرہ لگا ہوا تھا

اس کی آنکھیں بھی کچھ روئی روئی سی تھیں
اور میں بھی اس شام بہت ہی تھکا ہوا تھا

بھیگ رہا تھا سبزا اوس کے موتی پہنے
سوکھا بادل کنوئیں کے اندر گرا ہوا تھا

بچہ اک پہیے کو لے کر بھاگ رہا تھا
وقت جھکی دیوار کے اوپر بہا ہوا تھا

شاہراہوں پر اکھڑے اکھڑے سانس پڑے تھے
دریا بھاری شہر کے نیچے دبا ہوا تھا

سینے سے سانسوں کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا
قیدی کے پیروں کا تالا کھلا ہوا تھا

○

ایک اور شام

آپس کی سب ان کہی باتوں
یاد کے صحن میں
واپس گرتے
خالی لفظوں
پیلے کاغذ کے پرزوں کو
ایک جگہ پر رکھتے جاؤ
چاند کی پہلی تاریخوں میں
چھت پر بیٹھ کے

روِش پہ ٹھنڈا پانی رکھ کر
اُن راتوں کے لمس کو سوچو
جن میں اُس رخسار کے نازک پھول
ہوا کی حدت سے مرطوب، بہت نزدیک تھے
اور زلفوں سے اُڑتی ایک خفیف مہک
لمحوں کو
صدیوں تک پھیلا دیتی تھی
جنسِ لطیف کی قربت
لرزہ بن کر
دل کے پورے شہر کو ڈھا دیتی تھی
موسم گرما
شام، چھتیں، محراب
خنک چھڑکاؤ
ستارے
دنیا ایک تحیّر خانہ تھی
جس میں اک روشن چہرا
جگہ جگہ پر لکھا ہوا تھا
کیا جادو تھا
ہاتھوں کے مس سے چنگاریاں پھوٹتی تھیں

ہم جب ملتے تھے
دن خوابوں اور راتیں آنکھوں میں کٹتی تھیں
لیکن سب تصویریں
چہرے
لفظ، آوازیں
پردے پر چلتے منظر ہیں
برقی لہروں کے محتاج
اور اب پوروں میں بے حس خلیے
آ گے آ کر بیٹھ گئے ہیں

اب کیا کرنا ہوگا
اچھا یہی کرو
کہ شام کو چھت پر کھیس اوڑھ کر بیٹھو
اور سب
کہی، ان کہی
گزری باتوں
بیتے لمحوں کی گرہوں کو
پھر اپنے دانتوں سے کھولو
ایک جگہ پر رکھتے جاؤ

ذہن میں باقی تصویروں کے
سارے مڑے تڑے کاغذ
سیدھے پھیلا کر
پھر اپنے سینے سے لگاؤ
یادوں کی بارش سے گزر کر
گیلے لفظوں کی مٹی سے
پھر اک زندہ نظم بناؤ

غزل

اس کی آنکھوں میں محبت کا گماں تک نہیں آج
کون سی آگ تھی کل ، جس کا دھواں تک نہیں آج

آہنی راستے اگتے ہیں درختوں کی جگہ
والئِ شہر کو احساسِ زیاں تک نہیں آج

ہم ہیں تاریخ کی راہوں کے مسافر جن کی
یہ نشانی ہے ، کہ ایسوں کا نشاں تک نہیں آج

وہ تو کہتے ہیں کہ اب کہہ لو جو کہنا چاہو
پر کوئی شکوہ مری نوکِ زباں تک نہیں آج

لوگ آنکھوں میں چمک کیسے بنا لیتے ہیں
پسِ مژگاں تو کوئی اشکِ نہاں تک نہیں آج

ہو نہ ہو آج مقرر ہے مرا آخری دن
مرے بارے میں کوئی جھوٹا بیاں تک نہیں آج

بات تو گرچہ بہت دور تلک جاتی ہے
آج بس اتنا ہی کافی ہے، وہاں تک نہیں آج

○

غزل

کسی بنجر تخیل پر، کسی بے آب رستے میں
ذرا ٹھہرے تو پتھر بن گئے احباب رستے میں

سرابوں کی گلی ہے یا ترے گاؤں کا کونا ہے
لگا ہے خاک پر شیشے کا اک تالاب رستے میں

ابھی کچھ دیر پہلے پاؤں کے نیچے نہ تھے بادل
ابھی پھیلا گئی ہیں تیری آنکھیں خواب رستے میں

مری تیاریاں میرے سفر میں ہوگئیں حائل
کبھی تعویز بازو پر کبھی محراب رستے میں

سمندر اپنے مرکز میں کھنچا ہے میری آنکھوں کا
سو اب ممکن نہیں ہے روکنا سیلاب رستے میں

میں کافی دیر پہلے جس کو گھر میں چھوڑ آیا تھا
کھڑا ہے منہ پھُلائے اب وہی مہتاب رستے میں

سفر آساں نہیں ہوتا ، کمر پہ لاد کر دُنیا
چلے تو رفتہ رفتہ رہ گیا اسباب رستے میں

ہم ایسے راہ رو تھے کوئی بھی منزل نہ ہو جن کی
سفینے آرزو کے ہوگئے غرقاب رستے میں

○

دکھائی دے مجھے!

تری صورت نہیں ہے
رنگ، پیکر، روپ
ہر اک کیفیت سے ماورا ہے
پھر تجھے صورت گری کا شوق کیوں ہے!
کیوں
ستاروں، کائناتوں، آگ، مٹی سے
مسلسل کھیلتا رہتا ہے
شکلیں گھڑتا رہتا ہے
کہیں یہ تو نہیں
روحیں اگر پیکر سے عاری ہوں
تجھے اچھی نہیں لگتیں
یا پھر روحیں
کبھی پیکر سے عاری رہ نہ سکتی ہوں!
یہ تو کیسا مصور ہے

کہ تیرے کینوس پر جسم کھنچتے ہیں
کوئی کیڑا ابھی بنتا ہے
تو بطنِ کہکشاں تک ارتعاشِ فن گزرتا ہے
تری تخلیق کا اعجاز یہ ہے
کہ تری مخلوق بھی خالق ہے
ہر ذرّہ ترا
ذوقِ خدائی دل میں رکھتا ہے
میں ان ذرّوں میں اک ناچیز ذرّہ ہوں
مرے سوکھے ہوئے رنگوں
پھٹے کینوس کی جانب دیکھ
مجھ کو بھیک دے تصویر کی
ٹوٹے ہوئے ہاتھوں کو طاقت دے
دکھا مجھ کو
مری آنکھوں کو منظر تک رسائی دے
اتر مجھ پر
مجھے تصویر سے پہلے
دکھائی دے

○

غزل

ابھی وہیں پر رکی کھڑی ہیں ہوا میں باتیں
چلو چلیں پھر ، جہاں پہ تھیں ابتدا میں باتیں

یہ سوکھے پتے نہیں، زمانے پہ تبصرے ہیں
شجر نے لکھ کر بکھیر دی ہیں فضا میں باتیں

نہیں ملے تم، تو چپ رہے صبر شکر کرکے
خدا سے شکوے کیے، نہ تم سے دعا میں باتیں

گزر گئے سارے عہدِ ماضی کی سمت لمحے
اتر گئیں سب ہماری ، بحرِ فنا میں باتیں

کوئی نہیں جو کلیدِ گم گشتہ ڈھونڈ لائے
کھدی پڑی ہیں حروفِ معجز نما میں باتیں

زیادہ باتیں نہیں تھیں، پھر بھی طلب یہی تھی
رسائی پائیں کسی کے ذہنِ رسا میں باتیں

خود ان کے خالق انہیں کبھی کے بھلا چکے ہیں
بھٹکتی روحیں ہیں کوچۂ بے نوا میں باتیں

○

غزل

جو ہزار چاند لگائیں گے ، اسی دھول میں اسی خاک میں
سبھی ایک دن چلے جائیں گے ، اسی دھول میں اسی خاک میں

کئی صورتیں ہیں مٹی ہوئیں ، تری جھاگ پر تری ریت میں
کوئی شکل پھر سے بنائیں گے ، اسی دھول میں اسی خاک میں

یہی شہر ہے ، یہی دشت ہے ، یہی بود ہے ، یہی ہست ہے
یہیں آ کے خیمہ لگائیں گے ، اسی دھول میں اسی خاک میں

نئی منزلوں میں شکستہ پائی کے سلسلے ہیں نئے نئے
جو گئے ہیں لوٹ کے آئیں گے، اسی دھول میں اسی خاک میں

اسی راہ میں ، اسی چاہ میں، اسی دیس میں ، اسی بھیس میں
ہمیں آپ بس یہیں پائیں گے، اسی دھول میں اسی خاک میں

یہی بے یقیں مرے آج کل، یہی بے عمل مرے پھول پھل
شجر آرزو کا لگائیں گے ، اسی دھول میں اسی خاک میں

مرے صوفیوں کا کمال ہے، نہ تو حُزن ہے نہ ملال ہے
سو دھمال ناچتے جائیں گے، اسی دھول میں اسی خاک میں

○

غزل

دریچہ آئینے پر کُھل رہا ہے
مجھے اپنے سے باہر جھانکنا ہے

اکیلا ٹوٹی کشتی پر کھڑا ہوں
کنارا دور ہوتا جارہا ہے

اسے پہچاننا آسان نہیں جو
ہوا کا رنگ، پانی کا مزا ہے

کہیں اندر ہی ٹوٹے ہوں گے الفاظ
ابھی تک تیرا لہجہ چبھ رہا ہے

وہ اپنے دوستوں کے درمیاں ہے
یا میرے دشمنوں میں گھر گیا ہے

کسی نے آئینے پر ہونٹ رکھ کر
اچانک شوق کو بھڑکا دیا ہے

خدائے لم یزل تیرے لیے تو
جو ہونا تھا وہ گویا ہوچکا ہے

وہ کیسے آزمائے گا کسی کو
جو پہلے ہی سے سب کچھ جانتا ہے

○

غزل

کہاں جاتے ہو میاں ، کچھ تو خبر دے سکو ہو
ہم بھی چلتے ہیں اگر زادِ سفر دے سکو ہو

ہم فقیروں سے ملو شوق سے پر اتنا بتاؤ
عرضِ غم سن سکو ہو، دادِ ہنر دے سکو ہو

تم جہاں ہو وہاں خورشید بھی ٹھہرا ہوا ہے
اب تمہی اس شبِ فرقت کو سحر دے سکو ہو

کہکشاؤں کے دھندلکے سے گزرنے والو
تھوڑا سا راستہ دے جاؤ اگر دے سکو ہو

ابھی رک جاؤ اگر راہِ وفا سامنے ہے
پہلے یہ سوچ لو ، کیا بات پہ سر دے سکو ہو

ہم نے ہرکارے سے بھجوادیۓ سب خواب تمہیں
ان کے بدلے ہمیں کچھ نقدِ نظر دے سکو ہو

○

زبانِ غیر

(رنکو دتہ کی نذر)

ماں

تو نے کیوں اس بولی کو

اپنی اس میٹھی بولی کو

کوشش کر کے

جان بوجھ کر

مرے لیے اجنبی بنایا!

اب اپنے اجداد کی باتیں

میرے کان کا بوجھ

زباں کا طوق ہوئی ہیں

کب سے دُکانِ فکر بند ہے
سازوں پر مٹی ہے
اور آہنگ پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
سارے گیت
وہ نئے خیال
جو مرے لبوں پر سجتے تھے
اب دور کہیں
پگھلے ہوئے سیسے کے دریا میں
شاں شاں کرتے رہتے ہیں
میری نظر کا چاندی سونا
پتھر کے ڈھیروں کے نیچے دبا ہوا ہے
ماں یہ کیا ہے
بولتی ہوں
تو اپنے آپ سے نفرت کیوں ہونے لگتی ہے
سانس اکھڑنے کیوں لگتے ہیں
دل کیوں متلانے لگتا ہے
اب تو ہر لمحہ بھاری ہے
جیسے شہرِ غیر میں ہوں، پت جھڑ جاری ہے

بے ترتیبی سے گرتے سوکھے پتوں کو
شاخوں پر اٹکانا چاہوں
گونگے ہاتھوں
اوپرے لفظوں سے ان کو بہلانا چاہوں
لیکن یہ کچھ نہیں سنیں گے
نہیں رکیں گے
وقت تو خیر گزر جائے گا
موسم بھی بدلے گا لیکن
سوچ رہی ہوں
بادِ بہار نے
جب بچوں کے سینوں میں جذبے دہکائے
پھول کھلائے
وہ اس کو کیسے سمجھیں گے
کس آہنگ میں
گیت کریں گے!

○

غزل

تری تخلیق ، ترا رنگ حوالہ تھا مرا
کون کہتا ہے کہ انداز نرالا تھا مرا

میں جہاں پر تھا وہیں تُو تھا مرے آئینہ گر
تری تصویروں سے بھرپور رسالہ تھا مرا

چاہتا تھا میں دعا مانگنا پر کیا کرتا
مرے ہاتھوں میں تو لبریز پیالہ تھا مرا

مجھے پہلے کئی صدیوں کی سزا کاٹنا تھی
منزلِ صبح سے بہت دور اجالا تھا مرا

میں اُسے بھول گیا تا کہ اُسے یاد نہ آؤں
کتنا محبوب مجھے بھولنے والا تھا مرا

ہوں تہی دست مگر منتِ کشکول نہیں
مُہرِ تسکین مجھے ہاتھ کا چھالا تھا مرا

زہر پیتے ہوئے خاموش ہی رہنا تھا مجھے
شاخِ تسلیم سے گُل پوش پیالہ تھا مرا

دوسری زندگی دینے کی ضرورت ہی نہ تھی
ہر نئی شکل کی صورت میں ازالہ تھا مرا

یہ جو دنیا میں سرِ موجِ ہوا لکھا ہے
مرے یاروں نے کبھی نام اچھالا تھا مرا

○

غزل

کچھ دیر تو ایمان کی راہوں پہ چلا میں
پھر راہ ہمیشہ کی طرح بھول گیا میں

آئینہ دُھلا اتنا کہ پھیکے ہوئے منظر
ہر شامِ طرب رنگ کو بے رنگ لگا میں

آنکھوں کے ہنڈولے میں جھلاتا رہا پانی
پربت کی طرح آج بھی خاموش کھڑا میں

بچتا نہ کبھی ، شکر ہے ، خالی تھے مرے ہاتھ
پندار کی اونچائی سے جب گرنے لگا میں

کوتاہ نگاہی تھی تماشے کا بہانہ
دیکھوں تو یہ سمجھو کہ نہیں دیکھ سکا میں

مرشد تو نہیں مرسلِ آوارہ صفت ہوں
منزل پہ رکا میں، نہ مراسم پہ چلا میں

ناواقفِ اسرار تھا کیف و کمِ مے سے
''ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں''

○

غزل

یہ کائنات کہاں، خاکِ ارضِ فانی کہاں
اور اہلِ ارض کا یہ زعمِ جاودانی کہاں

مجھے تو خوف سے، طاقت سے ، جبر سے نہ بدل
چلا دلوں پہ یہ اندازِ حکمرانی کہاں

چمک ملی ہے ہمیں صرف چند لمحوں کی
نصیب ریگِ رواں میں ہُوا ہے پانی کہاں

سفر کیا ہی نہیں، دم درود کرتے رہے
نشانِ راہ سے ملتی ہمیں نشانی کہاں

کٹی پھٹی ہوئی مٹی ہے دور دور تلک
طبع میں لہر کہاں، لہر میں روانی کہاں

زمانہ ہوگیا باراں کو آگ برساتے
اب آسمان کی رنگت بھی آسمانی کہاں

عداوتوں کا تعلق ہے جس کسی سے بھی ہے
میں رکھ کے بھول گیا مُہرِ مہربانی کہاں

عجیب بات ہے یہ راستہ کٹا کیسے
کہاں سے کہتے ہوئے آگئے کہانی کہاں

حیات اپنے ہی کاندھوں پہ بوجھ ہے اپنا
مجھے اُتار کے رخصت ہوئی جوانی کہاں

یہ سچ ہے کام چلایا ہے ہم نے باتوں سے
اگرچہ بات بھی آئی ہمیں بنانی کہاں

ہمیں خبر ہے کہاں پر پڑاؤ ڈالنا ہے
کٹیں گے ہاتھ کہاں، بند ہوگا پانی کہاں

جو شعر ہو نہ سکا ، کچھ مصوّری کر لی
زباں دراز کو راس آئے بے زبانی کہاں

وہ زندگی کی طلب شاہنوازؔ کیسے ہو
جب اپنا سر نہیں باقی تو سرگرانی کہاں

○

تعلیم یافتہ

گاؤں میں
اک جوہڑ کے کنارے
اُڑتی مٹی کے پیچھے
اک مکتب تھا
ہم جس میں سحر دم
لمبی قطاریں باندھ کے باہر
دعا، ترانہ اور نماز پڑھا کرتے تھے
اور پھر بجھی ہوئی آنکھوں،

بوجھل پیروں پر

واپس چل کر

خود سے بھاری بستے اپنی کمر پہ لادے

جلدی جلدی اپنی کلاس میں آجاتے تھے

ٹاٹ جھاڑ کر

خوب سلیٹ کو چمکا کر

استاد کا حقہ بھر کر

پڑھنے بیٹھتے تھے

اور رٹے ہوئے اسباق کی بازی

کھیلنے کی کوشش کرتے تھے

ہم سب میں سے

ایک کو بھی معلوم نہیں تھا

لب پہ دعائیں بن کے تمنا

کب آتی ہے

کیوں آتی ہے

بلیک بورڈ پر لکھے طلسماتی الفاظ کا

سوُجے ہاتھوں کی پوروں سے کیا رشتہ ہے

ذو اضعافِ اقل، عادِ اعظم

باغ کا رقبہ

دو سو تیس بٹا اکتالیس

یہ سب کیا ہے

سانس گلے میں کیوں پھنستے ہیں

انگلیاں کالی کیوں رہتی ہیں

مہربان استاد کے آگے

گھٹنے کانپنے کیوں لگتے ہیں......

عمر کٹی

پر حرفِ تمنا اور لبوں میں بُعد وہی ہے

لوگوں اور ہندسوں کا خوف

ابھی تک

سینے میں بیٹھا ہے

افسر کی تعظیم میں

آنکھیں جھکی ہوئی ہیں

گردن خم ہے

دل باغی ہے

بخت سیہ ہے

○

محبت

ہم یونہی نہیں مل جاتے ہیں
پہلے دو شاخیں پھوٹتی ہیں
پہلے دو پنچھی گاتے ہیں
صحرا میں ریت سمٹتی ہے
بادل پر شکل ابھرتی ہے
اک بادِ مخالف کی شہہ پر
لمحے طوفان اٹھاتے ہیں
ہم یونہی نہیں مل جاتے ہیں

روحوں کی دنیا جاگتی ہے
جوتش کے سارے ماہرین کی زرد کتابیں کھلتی ہیں
پھر لب بھینچے، ابرو تانے
ٹیڑھے خط کھینچے جاتے ہیں
گھر بنتے ہیں، گھر مٹتے ہیں
تب بُرجِ زحل کے سائے سے شرما کر چاند نکلتا ہے
ناممکن ممکن بنتا ہے
اندازے ساتھ نبھاتے ہیں
ہم یونہی نہیں مل جاتے ہیں

ایتھر کے ٹھنڈے پتھر پر
امکان کی لہر ابھرتی ہے
جب کسی کروڑوں سال دور مدھم گمنام ستارے پر
تخلیق کی بارش ہوتی ہے
اور موت کے جمے سمندر میں
اک جرثومہ اگ جاتا ہے
پھر شور حیات کا اٹھتا ہے
جب وقت گزرنے سے تھک کر
اپنے دامن میں رکتا ہے

تب بات ہماری چلتی ہے
تب ہونٹ کنارے ملتے ہیں
دل آپس میں ٹکراتے ہیں
ہم یونہی نہیں مل جاتے ہیں

○

غزل

مرے خدا کوئی چھاؤں، کوئی زمیں، کوئی گھر
ہمارے جیسوں کی قسمت میں کیوں نہیں کوئی گھر

اے بے نیاز بتا حشر کب معین ہے
بہت لرزنے لگا ہے تہہِ جبیں کوئی گھر

کمر پہ لاد کے چلتے رہو گے تنہائی
تمام عمر ملے گا نہیں کہیں کوئی گھر

مکان بننے سے کوئی جگہ بچی ہی نہیں
ہُوا تو کرتا تھا پہلے کہیں کہیں کوئی گھر

کوئی عذاب تھا جو سارا شہر لے ڈوبا
کہ چھوڑتے ہیں بھلا اس طرح مکیں کوئی گھر

غزل

دل ملا ہے وہ کہ دشمن ہے ہر اک تدبیر کا
انگلیوں سے بھاگتا ہے مرحلہ تسخیر کا

ظاہری آنکھوں سے ، باطن کس طرح آئے نظر
صورتیں دنیا کی ہیں اور آئینہ تقدیر کا

خونِ دل اس میں لگایا تھا ، خدایا خیر ہو
ڈر گیا ہوں رنگ اُڑتا دیکھ کر تصویر کا

تیرے منصوبے کا بھی اس پر ہی تھا دارو مدار
ہم بھی چکھنا چاہتے تھے ذائقہ تقصیر کا

اب نئے انداز کی تحریر ہونا چاہیے
مصحفِ تاریخِ انساں ہے سفر شمشیر کا

جو کہا تھا تُو نے، وہ لکھا گیا تھا اب یہ دیکھ
میں نے کیا مطلب نکالا ہے تری تحریر کا

شاعری میں قیدِ مجنوں کی روایت کے طفیل
بات یوں پھیلی کہ زیور بن گیا زنجیر کا

○

غزل

تم گزرو اور وقت نہ ٹھہرے، ایسا تھوڑا ہوسکتا ہے
یاد آؤ اور درد نہ بھڑکے ایسا تھوڑا ہوسکتا ہے

صبر کیا ہے ، شکر کیا ہے ، راضی ہو کر دیکھ لیا ہے
لیکن دل کو چین آجائے، ایسا تھوڑا ہوسکتا ہے

ترکِ محبت کرلینے سے ترکِ محبت ہو بھی جائے
کوئی اسے جا کر سمجھائے ، ایسا تھوڑا ہوسکتا ہے

جب تم نے سب راز کی باتیں گوشِ موجِ ہوا سے کہہ دیں
شاخ و شجر تک بات نہ پہنچے، ایسا تھوڑا ہوسکتا ہے

گذرا لمحہ گزر گیا ہے، اس پر اشک بہانا کیسا
مٹھی میں پانی آجائے، ایسا تھوڑا ہوسکتا ہے

پہلے جیسا نہیں ہے کچھ بھی، اس پہ تعجب کرنا کیسا
دھوپ ڈھلے اور رنگ نہ بدلے ، ایسا تھوڑا ہوسکتا ہے

ہسٹریا

یہ کیسا آسیب ہے ماں
جو کنپٹیوں اور ناف کے بیچ میں پھنس کر بیٹھا
دل پر ٹھوکریں مار رہا ہے
دھواں بنا کر
کبھی مجھے یہ
ہوا سے ہلکا کر دیتا ہے
کبھی مجھے بانہوں میں جکڑ کر
جسم میں پتھر بھر دیتا ہے......

میرے حلق میں
گوشت کے بھاری بھرکم گولے پھنسے ہوئے ہیں
سر میں روشنی کے
جتنے پر کیف دھماکے ہوتے ہیں
میں اتنا ہی
گہری کھائی میں
منہ کے بل گرتی جاتی ہوں......
یہ کیسے عفریت ہیں ماں
جو اپنے لمبے لمبے دانتوں سے
مرا جسم ادھیڑتے ہیں
اور مجھ کو تڑپتا دیکھ کے چسکارے لیتے ہیں
چیختی ہوں تو
یہ میری آواز چُرا کر
اس میں اپنے گلے کی خرخر بھر دیتے ہیں
مرا قصور تو کوئی بتاؤ
میں نے تو پردے سے کبھی باہر نہیں جھانکا
پانچوں وقت نماز پڑھی ہے!
شہر کے سارے
مولوی، عامل

جادو، منتر

سب گنڈے، تعویز، دھویں، کافور، کچھو کے
میرے اندر کے جنات کو
باہر کھینچنے سے عاجز ہیں
اب میں بس میں نہیں رہی ہوں
جتنا چاہے زور لگاؤ
کھال ادھیڑو
خون بہاؤ
جسم کو داغو
میری روح میں گڑی سوئیاں
اور بھی گہری ہو جائیں گی
کوئی چاہتا
تو یہ سوئیاں
تھوڑے پیار سے
ذرا توجہ سے
شفقت سے
انگلیوں کے اک سبک لمس سے
آنکھ کے ایک اشارے سے بھی
آسانی سے

چھن سکتا تھا......!

○

ایک منظر

سٹاک ہوم کی ریل سے باہر
کالے، خشک درختوں کا اک بھاگتا لامتناہی جنگل
سبزے کی پوشاک پہننے کا طالب ہے
مارچ گیا تو چند دنوں میں
ان سب کے دن پھر جائیں گے
آناً فاناً
رنگ ہوا میں بھر جائیں گے......
بادِ بہار

مجھے بھی ایسا گیت سکھا دے
جس کو سن کر
میرے ملک کے ننگے بچے
ترے کرم سے
سبز، سنہرے، سرخ لباس پہن کر جھومیں
اور آنکھوں میں حسرت لے کر
گلیوں میں بیکار نہ گھومیں!

غزل

آنکھ پھر تیرے خواب سے بھرلوں
یہ پیالہ سراب سے بھرلوں

دل میں اندیشۂ فراق آیا
روشنی آفتاب سے بھرلوں

کس لئے طالبِ ثواب بنوں
سر حساب و کتاب سے بھرلوں

کیسے تجدیدِ کارِ عشق کروں
روز وشب پھر عذاب سے بھر لوں

کامیابی کی راہ پر نکلوں
زندگی اضطراب سے بھر لوں

ہاتھ پھیلاؤں گا دعا کے لیے
پہلے چُلّو شراب سے بھر لوں

فصلِ گُل تو اجڑ ہی جائے گی
کیوں نہ گلداں گلاب سے بھر لوں

کاغذی ساتھ

تعلق کاغذوں سے ٹوٹ جاتے ہیں!
دلوں کے خواہشوں سے
اور مکانوں کے مکینوں سے
بہت دیرینہ رشتے چھوٹ جاتے ہیں
جو بوسے یاد کی الماریوں میں بند تھے
وہ دیمکوں نے کھا لیے
نظروں کے الجھے تار
بوسیدہ دنوں کے خالی ڈبے

آرزو کی بوتلیں، تصویریں، خط، اخبار
کوڑے میں گئے
باقی رہے آنسو
سوان کا کیا بچا ہوگا
کسی دامن پہ ٹپکے تھے یا مٹی میں گرے تھے
کون ڈھونڈے گا......
محبت کو ہماری رنجشوں نے
اور صداؤں کو ہوا نے کھالیا
اب لمحۂ موجود میں بس ایک کاغذ ہے
جو کہتا ہے
اناؤں کے تصادم سے
زمانے روٹھ جاتے ہیں
تعلق کاغذوں سے ٹوٹ جاتے ہیں!

○

غزل

جہاں گلدان گلابوں سے سجایا ہوا ہے
وہیں کونے میں کہیں زخم بھی رکھا ہوا ہے

اب بھی ہے چاروں طرف ایک ہی ٹوٹی ہوئی شکل
چاند پہلے کی طرح شاخ میں الجھا ہوا ہے

شوق سے کیسے چلیں اس پہ ترے راہ نورد
راستہ پہلے ہی سے تو نے بتایا ہوا ہے

پاس رہتا ہے جدائی کا وہ منظر اب تک
ترے کاجل کی طرح آنکھ میں پھیلا ہوا ہے

ایک ہرجائی ہے وہ ، اس پر بہت ناز نہ کر
تیرے ہونٹوں کو اگر چاند نے چوما ہوا ہے

اُڑنا چاہے تو بڑے شوق سے اُڑ جا لیکن
اب ترا رنگ مرے ہاتھ پہ چھوٹا ہوا ہے

'جو بھی آوے ہے وہ نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے'
شیشۂ چشم میں کس کس کو اتارا ہوا ہے

کوئی ہے، جو مجھے کہتا ہے ہر اک سانس کے ساتھ
پیکرِ خاک تجھے میں نے سنبھالا ہوا ہے

کیا خبر تھی کہ یہی سب سے بڑا دھوکا ہے
مجھ سے جب اس نے کہا آپ سے دھوکا ہوا ہے

بے گنہ جس کے سیاہ سیل میں بہہ جاتے ہیں
ہم نے وہ دورِ مکافات بھی دیکھا ہوا ہے

اب زمانے میں تجھے کچھ بھی نہیں بھائے گا
تری آنکھوں میں مرا عکس جو ٹھہرا ہوا ہے

غزل

الجھا اس کی دید میں
پڑا رہا تمہید میں

بھول گیا اس بار بھی
اثر نہیں تاکید میں

سیکھا من کو مارنا
افسر کی تائید میں

رہنا پل پل دھیان میں
ملنا عید کے عید میں

نامہ بر لکھوائے گا
تجھ سے نام رسید میں

اس کی شکل اتار لوں
گر آجائے کشید میں

کانچ تراشوں بیٹھ کر
ہیرے کی تقلید میں

ڈھونڈ خدا انسان سے
مرشد دیکھ مرید میں

صفر انا کو مان کر
مٹ جاؤ توحید میں

مجھے مصور مل گیا
چُھپا ہوا تجرید میں

ڈھالا ایک جنون نے
قطرہ مروارید میں

کچھ بے ہمت دھرتیاں
جڑی رہیں خورشید میں

کیوں آتا ہے لوٹ کر
وہی قدیم، جدید میں

واحد کو اصرار ہے
کیوں اتنا توحید میں

ہنسنا منع ہے
(اپنی ایک پینٹنگ پر نظم)

یہاں ہنسنا منع ہے
بات کرنا، دیکھنا، چلنا
کسی ذی روح کی مانند کھل کر سانس لینا جرم ہے
ایسا نہیں کرتے......!!!
مری بچی
تُو شاید پڑھ نہیں پاتی
تجھے چادر میں لپٹا دیکھنے کے آرزومندوں کی آنکھوں میں
یہ لکھا ہے

کہ ہم سب بھیڑیئے ہیں

بھیڑیوں کے تیز دانتوں سے بچاؤ کی یہی ترکیب ہے

خود کو دوشالوں میں لپیٹو

اس طرح

جس سے کہ انسانی شباہت تک نہ رہ جائے

مگر مشکل یہ ہے

ایسا کریں تو ان درندوں کی ہوس کچھ اور بڑھتی ہے

ہوس کیا چیز ہوتی ہے؟......

چلو چھوڑو

بس اتنا جان لو

ہنسا منع ہے......!

○

غزل

آؤ پھر مل جائیں سب باتیں پرانی چھوڑ کر
جا نہیں سکتے کہیں دریا روانی چھوڑ کر

وہ مرے کاسے میں یادیں چھوڑ کر یوں چل دیا
جس طرح الفاظ جاتے ہوں معانی چھوڑ کر

تم مرے دل سے گئے ہو تو نگاہوں سے بھی جاؤ
پھر وہاں ٹھہرا نہیں کرتے نشانی چھوڑ کر

اب سنا ہے عام شہری کی طرح پھرتے ہو تم
کیا ملا ہے میرے دل کی حکمرانی چھوڑ کر

بس ابھی طوفانِ غم کا تذکرہ آیا ہی تھا
سب گھروں کو چل دیے میری کہانی چھوڑ کر

اس طرح میرے قبیلے میں کبھی ہوتا نہیں
کیسے جاؤں تیرے غم کی میزبانی چھوڑ کر

یہ کلام اللہ کب ہے جو سدا باقی رہے
دارِ فانی سے چلے ہیں نقشِ فانی چھوڑ کر

ٹائم مشین

اسامہ!
تم وہ دیدہ ور نہیں ہو
جس کی خاطر چشمِ نرگس منتظر ٹھہرے
خدا جانے
تمہیں کس نے کہا تھا
صاحبِ دوراں بنو
اور دورِ حاضر کو بھی اپنے ساتھ ہی
زیرِ زمیں غاروں میں لے جاؤ

اسامہ!

آنے والا کل ابھی آیا نہیں تھا

اس کا پیکر تو

ابھی اک ابتدائی منزلِ صبحِ حمل میں تھا

ابھی اس کا ہیولا سا

تصور کی گزرگاہِ عمل میں تھا

ابھی کردار بننے میں ہزاروں سال باقی تھے

تمہیں امکان کی بس اک جھلک نے

ایسا دیوانہ بنایا

تم نے سارے خواب

پہلے ہی سے طشت از بام کر ڈالے!

سنو

لاکھوں کروڑوں بے حقیقت، بے لچک کمزور لمحے

کھینچ کر صدیوں کے تن پر

باندھنے پڑتے ہیں

تب جا کر فلک زنجیر ہوتا ہے

ہزاروں سال

ننگے پاؤں کانٹے روندنے پڑتے ہیں

اس کے بعد

پیروں میں زمیں تبدیل ہوتی ہے
امامِ وقت وہ ہوتے ہیں
جو ذہبِ حوادث اپنے سینوں کی کٹھالی میں
جلانے، پھونکنے، انگیز کر دینے
کا جوہر جانتے ہیں
کیمیاء
یوں ہی نہیں بنتا
کھڑے پیروں
مسیحائی نہیں آتی
کوئی جب بے اجازت اس طرح
جستِ زمانہ کر کے آتا ہے
تو اس کو حق نہیں ہوتا
کہ آ کر
روز و شب کے سلسلے میں
دخل اندازی کرے
اور آنے والے کل کا زریں تاج
اپنے فرق پر رکھ لے
اسامہ!
اب یہ سارا وقت

جو ٹیڑھا پڑا ہے
پہلی حالت میں نہ آیا
تو زمانہ تم سے پوچھے گا
تمہیں کس نے کہا تھا
خود کو ابنِ صاحبِ افلاک گردانو
اور الٹا
دشمنوں کا کام کر جاؤ!

○

اب کے دوسو ساٹھ مرے ہیں

اب کے دوسو ساٹھ مرے ہیں
دہشت گرد تھے یا انساں تھے
دین دار تھے یا شیطاں تھے
خفیہ ہاتھ تھا یا ظاہر تھا
ایسا کب تھا
آستین پر کوئی نشاں ہو
مارنے والے، مرنے والے
سب مظلوم برابر کے ہیں

اب کے دوسو ساٹھ مرے ہیں

چیخیں، وحشت، خون، آوازیں
وَا ہیں آنکھوں کے دروازے
زخمی چہرے، جسم کے پرزے
گرما گرم چائے کے ساتھ
تناول کر کے دفتر پہنچو
سب کچھ ویسے کا ویسا ہے
سب کچھ خوب ہے، سب اچھا ہے
بازاروں کے بھاؤ چڑھے ہیں
اب کے دوسو ساٹھ مرے ہیں!!

غزل

خطرہ گھر تک آپہنچا ہے
پانی سرتک آپہنچا ہے

اعتبار اٹھتا جاتا ہے
شک اندر تک آپہنچا ہے

خوفِ خدا کم ہوتے ہوتے
خوفِ بشر تک آپہنچا ہے

جینے سے آسان ہے مرنا
ظلم کدھر تک آپہنچا ہے

خالی سینہ ہونک رہا ہے
دل باہر تک آپہنچا ہے

ایمانوں میں زہر چھپا تھا
زہر اثر تک آپہنچا ہے

بہتے بہتے خون کا دریا
راہگذر تک آپہنچا ہے

ناداری کا پنجہ بڑھ کر
دستِ ہُنر تک آپہنچا ہے

سورج کے ہمراہ اندھیرا
طاقِ سحر تک آپہنچا ہے

بادِ صبا کا جھونکا چل کر
گردِ سفر تک آپہنچا ہے

اب تو محبت کرنا ہوگی
درد جگر تک آپہنچا ہے

○

عظیمِ مذہب یہ فیصلہ کر......

عظیم مذہب یہ فیصلہ کر
تری شریعت میں خونِ ناحق کی کیا سزا ہے
تری عدالت میں
امن کا اور سلامتی کا اصول کیا ہے
کہ میں نے دیکھا
ترے نبیؐ کو
گلی محلوں میں زخم کھاتے
دعائیں دیتے

کہ میں نے دیکھا ہے جسمِ اطہر پہ نفرتوں اور عداوتوں کا
غلیظ کوڑا گرانے والوں کو پیار کرتے
کہ میں نے دیکھا ہے
رحمتِ رب کے روپ میں آدمی کو ڈھلتے
عزیزوں، پیاروں کے قاتلوں کو معاف کرتے
بڑے بڑے ظالموں، دشمنوں کو گلے لگاتے
تو آج ہم کس کی پیروی میں
دکھوں کا بدلہ دکھوں سے
اور موت کی سزا
بے گناہوں کے خوں سے چکا رہے ہیں
ہم اپنے بچوں کو یہ کیا بتا رہے ہیں
کہ جس کو سن کر
وہ اپنی آنکھوں پہ بے حسی کے غلاف کھینچے
خیالی جنت کا خواب اوڑھے
بدن پہ بم باندھ کر
محلوں، کوچوں میں بے خبر آدمیّت شکار کرنے نکل پڑے ہیں
عجیب یہ جانثار ہیں، دشمنوں سے اپنے ملے ہوئے ہیں
یہ آپ ہی تیرے نام لیوا مٹانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں
وہ کون ہیں

کیسے راہبر ہیں
کہ جن کے باعث
ترے گلے میں بدی کا اور ظلم کا طوق پڑ گیا ہے
نگاہِ عالم میں تیرا چہرہ بگڑ گیا ہے
عظیم مذہب
یہ فیصلہ کر!

غزل

برگِ گل کی مثل مرجھایا ہوا
عکس پر دیکھو زوال آیا ہوا

دل کے گوشے سے ملا ہے ایک نام
خواب کے دھاگوں میں الجھایا ہوا

سامنے پھر سے وہی رخسار ہو
آتشِ صہبا سے دہکایا ہوا

دن پہ اترا شام کا زریں ورق
ضربتِ ساعت سے پھیلایا ہوا

پھر تری باتوں کا گلدستہ بنا
اک نیا دیوانِ گل شائع ہوا

ہے ترے رد و بدل کے سامنے
موسموں کا روپ دھندلایا ہوا

تن کبھی اپنا فرازِ دار پر
سر کبھی شانوں سے سرکایا ہوا

○

ایک امریکی فوجی کا خط

ماما عراق میں سب اچھا ہے
گھر سے دور یہ ہم کو اپنا گھر لگتا ہے
امن وامان ہے
خوشحالی ہے
لوگ ہمارے گن گاتے ہیں
سچ ہے ہم نے
ان کو ظلم سے بچالیا ہے
تبھی تو یہ ہر روز ہمارے رستے پھولوں سے ڈھکتے ہیں

ہم کو جھک جھک کر ملتے ہیں
جبکہ ان کے اپنے گھروں میں
بھوک ہے، دکھ ہے
مایوسی ہے
لیکن یہ اس کے عادی ہیں
تیسری دنیا کے ملکوں میں
یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے......
ہاں ماں
کل اودن نے خود کو گولی مار لی!
اچھا بھلا تھا
میرے ساتھ بیئر پی کر ہنستا رہتا تھا
اور اچانک......!!!
لیکن تم کچھ فکر نہ کرنا
خودکشی کرنا اب معمول ہے
اس سے پہلے بھی ستر امریکی فوجی
اپنی جان سے کھیل چکے ہیں
تم تو جانتی ہو یہ جنگ ہے
اس میں تلف ہونا پڑتا ہے
سوچ بہت بیکار چیز ہے

سوچنے والے سینکڑوں لڑکے
واپس جا کر
اب ذہنی امراض کے فوجی پاگل خانوں میں محبوس ہیں
فوجی سوچیں گے
تو آخر لڑیں گے کیسے
ملک کی خاطر مریں گے کیسے!

جنگ بہت اچھی تھی ماما
جب سے لڑائی ختم ہوئی ہے
روز کئی ساتھی مرتے ہیں
کل ڈیوڈ کے ٹینک کو اک بزدل نے بم سے اڑا دیا تھا......
ٹمّی کیسی ہے
اور اس کا بوائے فرینڈ؟
کیا دونوں ٹھیک ہیں
میں بھی ٹھیک ہوں
گرمی ہے
اور میرا سوٹ بہت بھاری ہے
ٹینک میں بیٹھے بیٹھے میرے دونوں پاؤں سوج گئے ہیں
پھر بھی میں اور میرے ساتھی

امریکہ کی آزادی، جمہوریت اور انصاف کی خاطر ڈٹے ہوئے ہیں
مجھے یقیں ہے
گر میں زندہ گھر پہنچا
تو ڈیڈی مجھ پر فخر کریں گے

بھونچال

(۱)

موت کا سائبان تھا
سر پہ جو آسمان تھا

ادھڑی ہوئی زمین پر
بکھرا ہوا جہان تھا

کچلی پڑی ہے زندگی
ایک بھی گھر بچا نہیں

پھول کا کنکریٹ سے
کوئی مقابلہ نہیں

(۲)

ماں نہیں ملتی

کہاں ہو ماں تم
تم تو ہمارے بن اک پل بھی
رہ نہیں سکتی تھیں

اور اب
مُنّی ہے نہ بھیّا!
پھر تم کس کے گھر بیٹھی ہو؟
مجھ سے خفا ہو؟
میں تو بھوکی سوئی پڑی تھی
جانے کیوں لوگوں نے مجھ کو
قبر سے باہر کھینچ لیا ہے!

ماں
یہ کیسا روزِ جزا ہے
جس میں نیک اعمال کی کوئی پوچھ نہیں ہے
لگتا ہے ہر سانس سزا ہے
ماں
کیا تم بھی حشر کے اس میدان میں ہو
یا تم سے
کچھ انصاف ہوا ہے؟

(۳)

اکیس گھنٹے

اکیس صدیاں!!

اور اب آخر

گاڑیوں پر امداد کے بنڈل آنے لگے ہیں

بسکٹ، کمبل، جوتے اور پرانے کپڑے

شہر سے لوگوں نے بھیجے ہیں

خوشبو تھی

جو گاؤں میں آج تعفن بن کر پھیل رہی ہے

سب دیواریں روٹھ گئی ہیں

منہ کے بل چھت گری پڑی ہے

بارش

ژالہ باری

سردی

دھرتی پھر سے کانپ رہی ہے......

صدیوں پہلے اسی زمیں پر

اک انسان نے رو کے کہا تھا

سب کچھ دکھ ہے

جینا

مرنا

باقی رہنا

سب کچھ دکھ ہے

ملنا اور بچھڑنا دکھ ہے

بسنا اور اجڑنا دکھ ہے

ہنسنا دکھ ہے

رونا دکھ ہے

اس دنیا میں ہونا دکھ ہے

سچ ہی کہا تھا

دکھ کے اس الجھے دھاگے میں

سارے انساں پھنسے ہوئے ہیں

مگر اسی دھاگے سے شاید

لوگوں کے دل بندھے ہوئے ہیں

دکھ کا پتہ بتانے والے نے

یہ جانے کیوں نہیں سوچا

تھوڑا تھوڑا بانٹنے سے

دکھ کٹ سکتا ہے

تھوڑا تھوڑا لے لینے سے

سارا بوجھ ہٹ سکتا ہے

آؤ کھولیں
ہاتھوں سے تدبیر کی گرہیں
پلکوں سے امکان کی راہیں
اگر ہمارا
دستِ دعا ہی دستِ عمل ہو
آج سے بہتر اپنا کل ہو
آج سے بہتر اپنا کل ہو

ہم لوگ

چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جب
دنیا کو دیکھا تو سب کچھ ٹیڑھا تھا
رستے، گلیاں، چہرے، بازو
کٹے پھٹے تھے
ہر منظر پر
خوف کی پپڑی جمی ہوئی تھی
دنیا وہم تھی
لوگ سائے تھے......

صدیاں گزریں
سایوں کے بازار میں ہم تم بیٹھے ہیں
سبز لبادوں پر بیکاری بھنک رہی ہے
چہروں پر صدیوں کی جہالت چمک رہی ہے
آنے والے کل کے در پر
بے علمی پہرے دیتی ہے
مایوسی گھر میں رہتی ہے

دُنیا، دُنیا کرتے ہیں
ہاتھ بڑھاتے، رال گراتے، بھیک مانگتے پھرتے ہیں
ہم سب کے سب
دولے شاہ کے چوہے ہیں!!

زلزلہ

چھوٹی سی ہنسی ادھار دینا
پُڑیا میں ذرا سا پیار دینا......

بچوں کی آنکھ کے افق پر
امید کا چاند پھر سے نکلے
پلکوں سے اٹھاؤ پتھروں کو
ہاتھوں کے بناؤ مل کے خیمے
اس راہ پر ساتھ آ کے دیکھو

ابھریں گے نشان منزلوں کے
لمحہ یہ نہیں گزار دینا
چھوٹی سی ہنسی ادھار دینا

جاتا ہے ہر ایک باری باری
اس بار تو سب کے سب گئے ہیں
جو پھول ابھی کھلے نہیں تھے
سب زیرِ زمین دب گئے ہیں
شاید یہ کبھی نہ جان پاؤ
کیسے مرے روز و شب گئے ہیں
آنگن کے باغ سے اٹھا کر
چٹکی میں مجھے بہار دینا
چھوٹی سی ہنسی ادھار دینا

○

غزل

اہلِ غرض ہیں لوگ سب ،شہر کے ہوں یا گاؤں کے
پھرتے ہیں لے کے جیب میں مرتبے آشناؤں کے

ناروا، کم نسب ، رزیل، رسوا، غریب اور حقیر
شہر میں تیرے کیا یہی نام ہیں خوشنواؤں کے

دھول ہوئیں وہ محفلیں، بُجھ گئے رت جگے تمام
راہ میں جابجا پڑے خول ملے صداؤں کے

تھا ترا راستہ عجیب، پہلے قدم کے ساتھ ہی
آنکھوں میں ریت بھر گئی، چبھ گئے نقش پاؤں کے

خوشبو کے ساتھ بند تھے، گزرے دنوں کے روز و شب
پھر ترے در پہ لے گئے، لمس مجھے ہواؤں کے

کوچۂ بے امان میں ، آگ کے سائبان میں
سبز شجر کی آنچ سے جل گئے ہاتھ چھاؤں کے

میرے تصورات سے ماوراء تیری کائنات
کیا مرے کام آئیں گے سلسلے کہکشاؤں کے

○

غزل

پہلے جیسا نہیں رہا ہوں
میں اندر تک ٹوٹ گیا ہوں

جیسے کاغذ پھٹ جاتا ہے
دو ٹکڑوں میں پڑا ہوا ہوں

دوست مرا کیوں ساتھ نبھاتے
جب میں ان کو چھوڑ چکا ہوں

کتنا چھوٹا سا لگتا ہوں
دور سے خود کو دیکھ رہا ہوں

شیشے کی دیواروں والے
اک کمرے میں قید پڑا ہوں

لوگوں کے ظاہر باطن کو
دیکھتا ہوں ، ہنستا رہتا ہوں

تصویروں کا قحط پڑا ہے
اور میں رنگ بہا بیٹھا ہوں

کوئی میرا حال نہ پوچھے
میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

○

تجدیدِ وفا

سردیوں کی آمد پر
لوگ گرم کپڑوں کو جیسے دھوپ دیتے ہیں
نیند جب نہیں آتی
جیسے کچھ نہ ملنے پر
ہم پڑھی پڑھائی اور بے مزا کتابوں کو
پھر سے پڑھنے لگتے ہیں
یونہی اک زمانے کے بعد
تم نے کل مجھ سے

پوری گرمجوشی سے گفتگو شروع کر دی!
وقت کا تو کچھ سوچو
اب تو سرد خانے سے نکلے اس تعلق کو
ایک لمبے عرصے تک
تم کو اپنی آنکھوں کے نیم گرم پانی میں
رکھ کے دیکھنا ہوگا
یاد کے دفینوں سے
پیار کھودنا ہوگا
حرف ڈھونڈنے ہوں گے
اشک مانگنے ہوں گے
اب بھلا ہنسی کی اک
یہ پھوار سی بارش
اس کا کیا بگاڑے گی
روشنی کا سوچا ہے؟
وہ کدھر سے پھوٹے گی
درد کی ضرورت ہے
وہ کہاں سے آئے گا؟
منجمد زمانوں کے ایسے سخت پتھر کو
صبر آزما حد تک

آتشیں محبت کا
مرتکز توجہ کا
لمس چاہیئے ہوگا

اتنے سارے جھنجھٹ سے
یہ زیادہ بہتر ہے
اپنی مشق کی خاطر
تم دوکان سے جاکر
سستے اور تازہ دم، جان و دل اٹھا لاؤ......!!

○

عرضِ حال

کسی اور وقت کی آنکھ سے
اگر آج کو بھی دیکھیے
تو بتایئے
یہی شام تھی؟
یہی لوگ تھے؟
کبھی خواب میں یا خیال میں
چلے آیئے
ہمیں دیکھئے اسی ہجر کی کسی رات میں

ابھی ذہن سے جو گذر رہے ہیں سوال سے
انہیں جھانکیئے کسی روز بامِ جواب سے
انہیں اُس مقام سے
دیکھیے جہاں جائیں گے
یہ جو کھل رہے ہیں گلاب سے......
یہ جو جل رہے ہیں ستارا رُو
یہ جہان ہیں
کسی وقت میں
یہ جو دل میں درد سا رک رہا ہے
زبان ہے
کسی کیفیت کا نشان ہے
اسے جانئے
یہ نہ ہو سکے تو یقین
اپنا تو کیجئے
مری بات کو
نہیں مانتے تو نہ مانیئے !

غزل

صفِ اوّل میں یا اربابِ ثانی میں نہیں ہے
مرا کردار ہی ساری کہانی میں نہیں ہے

میں رک تو جاؤں تیرے ساتھ نخلِ یادِ ماضی
مگر دریا نہیں ہے، جو روانی میں نہیں ہے

سمندر میں کہیں میدان آتا ہے یا گھاٹی
زمیں کا ظرف ہے، گہرائی پانی میں نہیں ہے

اے دُنیا دُور ہو جا، میرے دل سے دُور ہو جا
مری منزل فریبِ کامرانی میں نہیں ہے

ملا ہے کہکشاؤں سے مجھے کرنوں کا صدقہ
مرا فیاض جوشِ مہربانی میں نہیں ہے

اطاعت کی جگہ تُو نے محبت کیوں نہ مانگی
دلوں کے ساتھ ناطہ حکمرانی میں نہیں ہے

○

میں کچھ بھی نہیں

اگر میں ڈاکیہ ہوتا
ہوا کے ہاتھ سے لکھے ہوئے
پھولوں کے خط لے کر
تمہارے گھر پہنچ جاتا

جولاہا، میں اگر ہوتا
تو کھڈی پر تمہارے سانس سے
چادر بنا لیتا

اگر میں باغباں ہوتا
گزرتے بادلوں کے ہاتھ سے
چھاگل پکڑ کر
سوکھتے پودوں کے پیروں میں الٹ دیتا......

سپاہی میں اگر ہوتا
تو بچوں کا تبسم جمع کر کے
دشمنوں کی فوج کو مغلوب کر دیتا

اگر میں مستری ہوتا
تو سچے پیار کی بنیاد پر
روشن خیالی کا جہاں تعمیر کر دیتا

اگر میں ماسٹر ہوتا
تو کالی رات کے تختِ سیہ کو
میں تمہارا نام لکھ لکھ کر
سفیدی میں بدل دیتا!

غزل

میز پہ چہرا، زلفیں کاغذ پر
دیکھ رہا ہے حیرت سے دفتر

چہرے پر شکوہ کرتی آنکھیں
آنکھوں میں آدھا خالی ساغر

گال پہ تین لکیریں آنسو کی
کانوں میں ہیرے کے دو کنکر

باتوں میں موسیقی جیسی تال
ساڑھے سات اور پندرہ کا چکر

اب تو گھر سے باہر جانے دو
چپک گیا ہے کھڑکی پر منظر

عریانی کی بات نہیں اس میں
پھولوں کو دامن کی کہاں خبر

افسانہ تو نہیں حیات مری
ایک غزل تھی جس کا پیر نہ سر

اس امید میں گھاس پہ لیٹا ہوں
کوئی ستارا دے گا تری خبر

اپنے پاپ تو دھو ڈالے ہم نے
کیسے دھوئیں پانی کی چادر

خوابوں میں شطرنج کے چوخانے
بنا زور کے پیدل جائے کدھر

جب دیکھا کہ خیر نہیں ملنی
چھوڑ دیا امید نے میرا در

کارِ دنیا سے کیا پانا ہے
ریت بھری ہے مٹھی کے اندر

کاٹا تو دونوں مرجائیں گے
جڑے ہوئے بچے ہیں خیر اور شر

چھوٹی سی بات

یہ پہلی بار کہنا کس قدر دشوار ہوتا ہے
مجھے تم سے محبت ہے!!
بڑا سادا، پرانا اور معمولی سا جملہ ہے
مگر پہلے پہل کتنا جگاتا ہے!
نگاہیں جانتی ہیں تم اسی کی منتظر ہو
پھر بھی ہونٹوں پر کھڑے الفاظ
دروازے پہ آ کر لوٹ جاتے ہیں
اُسی ملبوس میں واپس نہیں آتے

ادھر یہ حال کہ لمحے نہیں رکتے

ہمارا مختصر سا ساتھ

اس تلوار سے باریک پُل پر کس طرح ٹھہرے!!

سنو

تم جانتی تو ہو

یہ ہمت تم کو کرنا ہے

اگر تم بات سمجھو

ہاتھ تھامو

اور پہل کر دو......

مجھے تم سے محبت ہے......

''شانتی نگر کی راکھ سے''

(جوسلین سعید کی نذر)

مری جستجو
مری رات دن کی پکار گھر کی تلاش میں
مرا گھر جو شہر سے مٹ گیا
مرا شہر جو
کڑی نفرتوں کے سمندروں میں اتر گیا
میں دریدہ جسم پڑی ہوں خاک کے ڈھیر پر
وہ قیامتیں تو گذر گئیں
مرے دل سے لرزا نہ جاسکا
نہیں مٹ سکی مرے ذہن سے یہ سبک سری کہ میں کچھ نہیں

مرا دیس پاک تو ہے مگر
کہیں دور تک
یہاں شانتی کا نگر نہیں
یہاں رینگتے ہوئے فرد ایسے ہیں
جن کے شانوں پہ سر نہیں
جو دوکانِ واعظ سے آگ پیتے ہیں
سنگ تھوکتے پھرتے ہیں......

مگر ایسی روحِ سفر بھی ہے
جو رکے تو ایک کھنڈر میں ٹھہرے گی
جس میں اب بھی وہ لوگ ہیں
جو محبتوں کے امین ہیں
یہ ڈسے ہوئے شبِ زرد کے
ہیں مداوا اگر مرے درد کے
مرا درد جس میں دوا بھی ہے
اسی درد سے
کہیں فردا میں
کوئی انقلاب بپا بھی ہے!

غزل

ہر کسی خواب کے چہرے پہ لکھوں نام ترا
میں اسے اپنا ہنر سمجھوں کہ انعام ترا

تتلیاں پھول میں کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں سدا
کیا کہیں بادِ صبا رکھ گئی پیغام ترا

جس طرح رنگِ شفق جھیل میں گھل جاتا ہے
عکسِ لب ایسے اُترتا ہے تہہِ جام ترا

رات آئے گی تو دکھلائے گا کچھ اور ہی رنگ
وہ جو دن بھر تو پرایا لگا اور شام ترا

فقط اس سوچ میں ہاتھ اٹھتے نہیں وقتِ دعا
میں بھلا کس طرح سمجھاؤں تجھے کام ترا

طاقچے ، گوشۂ دل ، فکر و عمل چھان چکے
کسی حالت میں بھی ملتا نہیں اسلام ترا

شمع بجھتی ہے تو دنیا میں سحر ہوتی ہے
اے سخن ور ترا آغاز ہے انجام ترا

غزل

کوئی تبدیل ہوا
چاند حیران لگا

کس لیے رہنے لگی
دوسری سمت ہوا

گرد تقسیم ہوئی
پرچم شام اڑا

خار و خس جلنے لگے
پھول مصلوب ہوا

گھنٹیاں بجنے لگیں
بت میں جب سانس چلا

خواب تقدیر ہوئے
آنکھ میں گرہن لگا

کھوکھلا جسم بنا
سانس مٹی پہ گرا

اٹھ کے تصویر چلی
پیکرِ عکس مٹا

ماتمِ شہر تو سُن
پردۂ گوش ہٹا

مرگِ انصاف ہوئی
اب سزا ہے نہ جزا

برگ و گل خاک بسر
ہر طرف آہ و بکا

سنسنی پھیل گئی
جھوٹ پھر جیت گیا

قتل امید ہوئی
اب صدا ہے نہ دعا

عاشقی ختم ہوئی
اب وفا ہے نہ جفا

وقت پر ڈال نظر
اپنی رفتار اٹھا

ظلم رکھتے ہیں روا
نام لیتے ہیں ترا

غزل

روشن آئینوں میں جھوٹے عکس اتار گیا
کیسا خواب تھا میری ساری عمر گزار گیا

وقت کی آنکھوں میں دیکھی کالی گھنگھور گھٹا
لیکن گز بھر چھاؤں نہیں تھی جب میں پار گیا

میں کیوں عرضِ تمنا لے کر اُس در پر جاؤں
موجِ بادِ صبا کے پیچھے کب گلزار گیا

اس دنیا میں بے قدروں سے کس نے پایا فیض
اُس کے پیار میں جینا مرنا سب بیکار گیا

اب سنسان گلی میں سایہ تک موجود نہیں
آدھی رات کے سناٹے میں کون پکار گیا

چہروں کو پیروں سے کچل کر آگے بڑھ جانا
جیت اسی کو کہتے ہیں تو پھر میں ہار گیا

غزل

آج آئینے میں چہرا ہی نہ تھا
تو نہ تھا تو کوئی میرا ہی نہ تھا

مٹ گئی جو بات دہرائی نہ تھی
بھر گیا جو زخم گہرا ہی نہ تھا

مَیں نے باتیں کی تھیں اُس سے رات بھر
سامنے سے چاند بولا ہی نہ تھا

تیرے جیسا کوئی ملتا ہی نہ ہو
رنج تو یہ ہے کہ ایسا ہی نہ تھا

سارا عالم تھا اضافت کا اسیر
کوئی سچا، کوئی جھوٹا ہی نہ تھا

آدمی کے روپ ہوتے ہیں کئی
وہ پرایا بھی تھا، اپنا ہی نہ تھا

میں بنا دیتا اسے پتھر کا بُت
لیکن اس نے مڑ کے دیکھا ہی نہ تھا

دوستو میں اس کے شک میں ہوں اسیر
میرا حلیہ جس سے ملتا ہی نہ تھا

وہ بھلا قسمت بدلتا کس طرح
میں نے جو نمبر خریدا ہی نہ تھا

خاک برسر پتیاں اُس کی بھی تھیں
شاخ سے جو پھول ٹوٹا ہی نہ تھا

دیکھتا تھا وہ فقط تاریک رُخ
آنکھ پر ساون کا سایا ہی نہ تھا

کھینچنے سے کیا اثر ہوتا اُسے
پیار کی ڈوری میں کانٹا ہی نہ تھا

جُز ترے دیوارِ گریہ پر کہیں
اور کوئی نام لکھا ہی نہ تھا

فطرتِ آدم کے ورثے کے سوا
کوئی میری وجہ گمراہی نہ تھا

کھیل سکھلاتے ہیں نفرت اور جنگ
ہارنے کا دل میں جذبہ ہی نہ تھا

واہ کیا لوگوں کے دل کی بات کی
شعر سن کر کوئی چونکا ہی نہ تھا

میراث
(اپنے والد کی رحلت پر)

وہ اک ناصح نہیں تھا
اور نہ میرا دوست
لیکن باپ ہونا اس کو آتا تھا......
اسے معلوم تھا
انسانیت اور وضع داری کی روایت
وعظ کے رستے نہیں
خاموش، بے کاوش عمل کے آئینے سے
سینہ در سینہ اترتی ہے

محبت کا شجر
تہذیب کے آنگن میں اگتا ہے
بھلائی اور نیکی کے
ہوا میں بیج اڑتے ہیں
تو دل کی نرم مٹی خود بخود آغوش وا کرتی ہے
کونپل پھوٹ پڑتی ہے
مگر اس کو
بہت محفوظ رکھو
بادوباراں سے بچاؤ اور گھنی چھتنار چھاؤں دو
تو جڑ کمزور ہو جاتی ہے
پودا
زندگی بھر
قدِ آدم تک نہیں آتا......
حیات اس کی
عجب اک بے نیازی سے عبارت تھی
جو فطری تھی
یا اس نے خود بنالی تھی
مگر اس بے نیازی سے پرے نگران آنکھوں میں
یقیں کے دیپ جلتے تھے

کبھی مذہب، خدا، تہذیب، رشتوں اور جذبوں کے
کسی موضوع پر اُس نے
ہمیں سمجھانے اور تاکید کرنے کی ضرورت تک نہیں سمجھی
کبھی اپنے عمل کو بھی جتا کر
اپنی ہستی کو مثالی شخصیت گردان کر
ہم پر نہیں کھولا
مگر ہم بہن بھائی سب
اسی کے راستے پر تھے
اُسی کے راستے پر ہیں
ہمارے ساتھ
ہنستا کھیلتا کم تھا
کوئی ناصح نہیں تھا وہ
نہ میرا دوست تھا
پر
باپ ہونا
اس کو آتا تھا!!

○

الوداع

اٹھاؤ جام روشن
آسماں پر جشن برپا
ہے ابھی مہندی رچے ہاتھوں
کی صورت برق چمکی
تھی وہ دیکھو بادلوں نے
پھول برسائے
افق کی سرخ ڈولی میں ابھی سورج
کی شرمائی دلہن

بس بیٹھنے کو
ہے اندھیری رات کی آنکھوں
سے کاجل
بہنے والا
ہے

○

چندا ماما

سر کو ڈھانپ کے
چادر کے سوراخ سے چاند کو دیکھو
آسمان کے مٹیالے فٹ پاتھ پہ لیٹا
کیسا تھر تھر کانپ رہا ہے!
مر جانے دو
میرے پاس رضائی ہوتی بھی تو اس کو کبھی نہ دیتا
رات یہ میرے پیچھے پیچھے
ڈنڈا لے کر

سارے سٹیشن پر بھاگا تھا......

لائنوں پر اور پلیٹ فارم پر

سیڑھیوں پر، ڈبوں کے نیچے

کاروں اور تانگوں کے پیچھے

اور پھر آخر

فوارے کے حوض میں گر کر ڈوب گیا تھا

ٹوٹ گیا تھا......

میرا دوست نہیں، یہ میرا ماما ہے

اور میں سب چاچوں، ماموں، باپوں، ماؤں سے

نفرت کرتا ہوں

بڑا ہُوا تو

ان کے تھپڑ، جوتے، مکّے

ان کو واپس لوٹا دوں گا

اِن سے تو کاروں میں بیٹھے

غیر ہی اچھے ہوتے ہیں جو

میرے ہاتھ میں چھوٹی سی پلیین دیکھ کر

بیزاری سے

مجھے سلام تو کر دیتے ہیں!

حد یہ ہے کہ پیٹ کاٹ کر

صمد بونڈ میں لاتا ہوں
اور اسے سونگھنے
چندا ماما آجاتا ہے
فوراً ساتھی بن جاتا ہے
اور جب کام نکل جائے تو
اس دنیا میں
مجھے
اکیلا کر جاتا ہے!

ایک اور منظر

کیا بات چھیڑی ہوا نے
تالاب ہنسنے لگا ہے
بارش برسنے لگی ہے
شاخیں سنہرے کنول کی
کچھ پھول اوڑھے کھڑی ہیں
پانی کی چادر کے اوپر
بوندوں کی کیلیں گڑی ہیں!

○

غزل

جب آفتاب سے چہرا چھپا رہی تھی ہوا
نظر بچا کے ترے شہر جا رہی تھی ہوا

میں اس کو روتا ہوا دیکھتا رہا چپ چاپ
چنبیلی گھاس پہ ٹپ ٹپ گرا رہی تھی ہوا

وہ ماں ہے آبِ رواں کی تبھی سمندر کو
اٹھا کے گود میں، جھولا جھلا رہی تھی ہوا

وہ خواب تھا یا سفر آنے والے موسم کا
مری پڑی تھی زمیں، زہر کھا رہی تھی ہوا

نجانے دوش پہ کس کو اٹھا کے رات گئے
طبیب شہر کا در کھٹکھٹا رہی تھی ہوا

میں گرم و سرد کو تقدیر سمجھے بیٹھا رہا
نظامِ موسمِ ہستی چلا رہی تھی ہوا

تمام عمر میں سمجھا ہوا مخالف ہے
مرے چراغ میں خود کو جلا رہی تھی ہوا

○

غزل

خواب کا سائبان دینا پڑا
آنکھ کو آسمان دینا پڑا

میری تخلیق ایک بھول تھی کیا
اُسے سارا جہان دینا پڑا

ماہ و لالہ کے داغ داغ نہیں
بے نشاں کو نشان دینا پڑا

جب خبر تھی اسے نتیجے کی
کیوں مجھے امتحان دینا پڑا

بے نیازی میری بڑھی اتنی
اسے مجھ پر دھیان دینا پڑا

زندگی کا مزا بدلنا تھا
موت کو درمیان دینا پڑا

حق کو حق ماننا پڑا آخر
صلۂ کشتگان دینا پڑا

اُس نے تعریف اس خلوص سے کی
کاٹ کر مجھ کو کان دینا پڑا

○

پگھلا ہوا چاند

رات کے سمندر کا آخری تلاطم جب
لوٹ جانے والا تھا
دفعتاً کسی شے نے
چاند آدھا کر ڈالا......!
گرہن ایسا لگتا تھا
جس طرح لوہار اپنی
گرم سرخ بھٹی میں
آئینے پکاتا ہو
خواہشیں جلاتا ہو!

○

احمد ندیم قاسمی

وہ برگد تھا
گرمی کے جلتے موسم میں
چھاؤں دے کر
چوپال سجایا کرتا تھا
وہ مالی تھا
ڈالی ڈالی، کونپل کونپل
جو قلم لگایا کرتا تھا
وہ شاعر تھا

اپنے شعروں سے دنیا میں

امید اگایا کرتا تھا

اک دیپک تھا

تاریکی کی دیوار پہ جو

جھل مل جھل مل

مستقبل کی تصویر دکھایا کرتا تھا

اک دوست تھا جو دشمن کو بھی

حسنِ ظن کے معنی سمجھایا کرتا تھا

اک انساں تھا

جس کی تخلیق پہ خوش ہو کر

خالق اِترایا کرتا تھا

○

گلزار

پھیری والا ہے گلزار
بائیسکل پر
پوٹلے میں لفظوں کے جگمگ سوٹ اٹھائے
دستک دیتا پھرتا ہے......
خوابوں کی خوشبو میں بھیگے
کویتا کے رنگین دوپٹے
نئے ڈیزائن والے جوڑے
دیس کی یادوں کے گل بوٹے

کھول کھول کر پھیلاتا ہے
ترساتا ہے
کچھ بھی خرید نہ پائیں لیکن
تھوڑی دیر کو
ہاتھوں میں ریشم کا لمس اور آنکھ میں
جامہ وار کی جھلمل رہ جاتی ہے
تھوڑی دیر کو
کمرہ روشن ہو جاتا ہے!

جادوگر ہے
ابھی ہاتھ میں درد کی کھدر کا ٹکڑا ہے
ابھی ستاروں کی جھالر ہے
ابھی چاند ہے
ابھی کچھ نہیں!!
کرن کناری ہے جھولی میں
حرف کبوتر ہے ٹوپی میں
گیت سنا کر
منڈوا کر کے
عجب تماشا دکھلاتا ہے

اور پھر جا کر چھپ جاتا ہے......

پھیری والے

اگلے سال ادھر آنا تو

اچھا اچھا بیج نہ آنا

چیت کی پچھلی تاریخوں میں

میری بیٹی کی شادی ہے!!

غزل

سبھی راستے ترے نام کے ، سبھی فاصلے ترے نام کے
کبھی مل مجھے ، مری سوچ کے سبھی دائرے ترے نام کے

مرے کام کے تو نہیں ہیں یہ ، یہ جو میرے لات و منات ہیں
یہ مجھے عزیز ہیں اس لیے ، کہ ہیں سلسلے ترے نام کے

میں شراب پیتا تو کس طرح، مجھے تیرے حکم کا پاس تھا
مگر آج ساقی نے جب دیے مجھے واسطے ترے نام کے

کوئی منبروں پہ ہے معتبر، کوئی سرکشیدہ ہے دار پر
وہ سہولتیں ترے ذکر کی، یہ مجاہدے ترے نام کے

یہاں جو بھی تھا وہ تجھی سے تھا، یہاں جو بھی ہے وہ تجھی سے ہے
سبھی عکس ہیں تری ذات کے، سبھی رنگ تھے ترے نام کے

ابھی میں نے ظلمتِ شب کی سمت نگاہ ڈالی تھی غور سے
کہ کسی نے دل کی منڈیر پر، دیئے رکھ دیئے ترے نام کے

غزل

ایک مانوس نام تھا، کیا تھا
وِرد جو صبح و شام تھا ، کیا تھا

ہاتھ اٹھائے تو بات بھول گئی
کیا مجھے کوئی کام تھا ، کیا تھا

وہ تھے اور میں تھا ایک محفل تھی
جانے کیسا مقام تھا ، کیا تھا

مرے سینے کے آسمان کے بیچ
وہ جو ماہِ تمام تھا ، کیا تھا

جس نے گرویدہ کرلیا سب کو
کس کا زورِ کلام تھا ، کیا تھا

کس کی کرنیں تھیں تیرے سورج میں
چاند پر کس کا نام تھا ، کیا تھا

کسی نقشِ قدم کی خواہش تھی
ایک سودائے خام تھا، کیا تھا

نعت تھی، یا غزل خدا جانے
حمد تھی یا سلام تھا، کیا تھا

○

ایک تصویر

اماوس ہے
خزاں کی آخری راتوں میں
پھر بیٹھے بٹھائے
خون میں گرداب پڑتے ہیں
رگ و پے میں ستارے ٹوٹتے ہیں

---

* راحت نوید مسعود کی ایک پینٹنگ "The other releam" پر لکھی گئی

سائنس

آنچل کی طرح سینے سے گرتے ہیں

سنہری، اطلسی، تانبے کی رنگت کی زمیں

پیروں سے اٹھ کر

جسم کو اپنے بدن کی بھاپ سے ایسا بھگوتی ہے

کہ جیسے کوری مٹی کے پیالے پر

کسی روغن کی تہہ کر دیں......!

ہوا کی کھڑکیاں کھولو

ستارے کانپتے ہیں

یہ عجب تاریک راتیں ہیں

کہ ماہِ زرد جن میں آسماں سے چھپ کے

برجِ وصل میں رہتا ہے

اور صبح تلک واپس نہیں آتا

کسی مضراب کی خواہش میں تن کر

سب رگیں سُر ہونے لگتی ہیں

بہاروں کی تمنا میں

شجر گیلی ہوا سے

آنے والی کونپلوں کے راز کہتے ہیں

خداوندا

مجھے تو نے بتانا ہے
بدن سے پھوٹتے، گہرے، سنہری رنگ کو
کیسے چھپانا ہے
کوئی صورت نہیں ملتی

مرا حرفِ دعا
ہاتھوں میں چکنا چور ہے
مٹھی نہیں کھلتی!!

○

خالد اقبال

آؤ دیکھو! یہ جادوگر کیا تصویر بنائے!
آسمان کینوس پر رکھ کر
دور کھڑا مسکائے
آسمان کا میلا آنچل، جس میں ممتا روپ
آنچل اندر کانپ رہی ہے
چلتی پھرتی دھوپ
کھیت کے آگے کھیت کھڑا ہے
دھوپ کے دوارے چھاؤں

مٹی کے پردے کے پیچھے ایک پرانا گاؤں
گاؤں کی کچی دیواروں میں کچے پکے لوگ
بے چہرا سی شکلیں ان کی
بے چہرا سے روگ
دھان کے کھیت سے باتیں کرتا، کیکر کا اک رُکھ
جس تن لاگے، سوتن جانے
کیا کیکر کو دُکھ
میں ان تصویروں میں اپنا بچپن ڈھونڈ رہا ہوں
پلکوں سے چھوتا ہوں منظر
خوشبو دیکھ رہا ہوں!!

○

پروفیسر پرویز وندل کے لیے ایک نظم

اے صنعت وفن کے جادوگر
روشن خوابوں کے سوداگر
استادِ زمن، مینارۂ فن
اے وارثِ رنگِ نقشِ کہن
اے ساقیِ چشمۂ آبِ بقا
متلاشیِ تہذیبِ اُولیٰ
سیماب صفت
معمارِ نفس

سرتاپا توانائی، حرکت
اے دوست بتا
ہم کو بھی بتا
تاریکیِ شب کے پتھر کو
سورج میں کیسے ڈھالتے ہیں
تعمیر کو کیسے جیتے ہیں
حیرت کو کیسے پالتے ہیں
وہ کونسی ڈھالیں ہیں جن پر
منفی سوچوں کو روکتے ہیں
اور کس ترکیب سے تری طرح
مٹی سے حسن نکالتے ہیں!

○

استاد شوکت حسین خان کے لیے ایک نظم

جب رقص کیا ایٹم نے
جب دل نے دھڑکنا سیکھا
جب خاک میں جنبش آئی
جب پھول نے کھلنا سیکھا
جب خالق نے بے ترتیبی کے امکاں سے ترتیب چنی
ہر شے کو اک آہنگ دیا
موسیقی کا آغاز ہوا
دھا تٹ کٹ تِنا کتّا......

دھاتٹ کٹ تِنا گتّا......

پھر اس نے زمین بچھائی
کہساروں کی میخیں گاڑیں
ہر شے جوڑے میں بنائی
دن جد و جہد کی خاطر
اور شب کو سکونِ جسم و قلب کے نادر لمحے بخشے
دھاگے دھاگے گے گے گھے......
دھاگے دھاگے گے گے گھے......

موسیقی ہے بادِ صبا میں
موسیقی آبِ بقا میں
ہر چیز میں موسیقی ہے
موسیقی روحِ خدا میں
موسیقی جیسے ہوا درختوں سے قصے کہتی ہو
موسیقی جیسے گھاس ستاروں سے باتیں کرتی ہوں
موسیقی جیسے سپنوں کی چھت پر بوندیں گرتی ہوں
موسیقی جیسے جادونگری میں پریاں چلتی ہوں
تٹ کٹ تٹ کٹ تا گے نا......
تٹ کٹ تٹ کٹ تا گے نا......

اے شوکت حسنِ سماعت

اے نوبتِ امن و محبت

اے رہبرِ راہِ سنگت

اے لَے کے مہا استاد

تیرا فیضان و سخاوت

دنیا کے ہر اک گوشے میں

جب تک سنگیت ہے باقی

جب تک یہ جہاں قائم ہے

ہر شام ہے تیری شام

ہر دن ہے تیرا دن

کڑ دِھن!

عملِ چغتائی

مجھے دیکھو
وہ مصور ہوں کہ محبوب نہیں سامنے
اور حسنِ دو عالم کی جھلک مجھ کو دکھائی ہے
مجھے چاندنی کی شکل بنانی ہے
بنانی ہیں وہ آنکھیں
کہ جو خیّام کے مے خانے ہوں
جمشید کے پیانے ہوں
افسانے ہوں جو پریم کے

غالب کی غزل ہوں
مجھے خط کھینچنے ہیں ایسے
جو پیکر کا بدل ہوں......
وہ چنوں رنگ دھنک سے
جو بہیں اور ملیں اور بہیں
اور نئے رنگ بنائیں
نئے آہنگ بنائیں
کبھی ایسے لگیں جیسے کہ منقش ہو
ستاروں سے بھری، رات کا آنچل
کبھی ایسے کہ ہو برسات میں اڑتا ہوا
گھلتا ہوا بادل!
وہ بدن میں ہو حرارت کہ نگاہیں لگیں جھکنے
وہ کھنچاؤ ہو، بناؤ ہو، لگاؤ ہو، تناؤ ہو
کہ سانسیں لگیں رکنے
میں تخیل ہی سے تخلیق کروں وہ پری پیکر
کہ جو تصویر کا معیار ہو
آفاق کا جھومر
سو دعا کر کے
بہت شکر ادا کر کے

سب اوسان جمع کر کے
میں بیٹھا تو یہ دیکھا
دمِ فرقت میں اسے سوچنا آسان ہے
دشوار ہے تصویر بنانا
گو میں عاشق ہوں پرانا
ہوں دوانہ
غمِ الفت کا نشانہ
میں بہانہ نہیں کرتا
میں محبت سے، لگاوٹ سے، مَشقّت سے
کسی سے نہیں ڈرتا
پہ کروں کیا
جو میں اُس نقش کو کھینچوں
تو کھنچے جاتے ہیں مژگان
تنے جاتے ہیں ابرو
تری آنکھوں کا یہ جادو
مرے آتا نہیں قابو
میں اگر ہاتھ کو روکوں
وہیں رک جاتا ہے گردوں
تری زلفیں

جنہیں خود میں نے بنایا ہے
سنوارا ہے
بکھیرا ہے بنا کر
انہی زلفوں کے خم و پیچ نے
اب دام میں کچھ ایسے لپیٹا ہے
کہ خط کھینچنا دشوار ہوا ہے
نہیں معلوم یہ کیا ہے
یہ تخیل ہے، حقیقت ہے
ستارا ہے کہ جگنو
یہ سرِ دشتِ تمنا
جو گھڑی بھر کو رکا ہے
وہ حسینہ ہے کہ آہو......!
یہ ترے نین، ترے نقش
ترا رنگ، ترا روپ
تری لطف و عنایت
ترے آداب و روایت
ترا اسلوبِ محبت
انہیں دیکھوں کہ چھپاؤں
یہ بڑھے جاتی ہے دھڑکن

اسی خواہش کے الاؤ میں جلا جاتا ہے تن من
دلِ خوش فہم کو
بس ایک ہی دُھن ہے
ترا دامن، ترا دامن، ترا دامن!......
نہ تصور میں ہے طاقت
نہ مرے ہاتھ میں دم ہے
کہ ترا نقش ابھاروں
کہ تری زلف سنواروں
کہ ترا روپ نکھاروں
یہ بتا دے
سرِ قرطاس پہ کس طرح اتاروں
تری آنکھوں کا خمار
اور ترے رخسار کی حدت
ترے چہرے کا پگھلتا ہُوا سونا
وہ اجازت دے
تو میں اُس کے کرم سے
کسی امکانِ عدم سے
کروں پیدا
ترا ہونا!

ابھی اثبات میں سر تو نے ہلایا تھا

تو کانوں میں ترے چاند سا چمکا

ترا جھمکا

متلاطم ہوا سینے پہ دمکتا ہوا زیور

یہاں بھاری

وہاں ہلکا

جو کہے تُو تو ہٹا دوں

ترے چہرے سے وہ آنچل

جو ابھی تک نہیں ڈھلکا......

مری محبوب

مرے خواب کی تعبیر

مرے فن کی صداقت

جو میں جلتا ہوں تری دائمی فرقت میں

تجھے پانے کی حسرت میں

محبت میں

تو معلوم ہے مجھ کو

کہ جدائی میں مری تُو بھی تڑپتی ہے

سسکتی ہے

تجھے بھی کسی طاقت نے

کسی دیو نے

رکھا ہوا ہے دامِ قفس میں

مگر افسوس

کہ تصویر کے پردے سے نکلنا

نہیں بس میں......!!

○

منصورہ احمد

کوئی عورت، کوئی انسان
یا لڑکی نہیں تھی وہ
وہ اپنے ذہن کی دنیا میں
اک نازک سی شیشے کی پری تھی
شاہزادی تھی
جسے بچپن میں ہی اک جادوگرنی نے بگڑ کر
زندگی کی بددعا دی تھی
اور انسانوں میں لا پھینکا تھا......

آنکھوں میں طلسمی سوئیاں پیوست کر کے ہوش لینے کی بجائے
اس نے دونوں پُتلیوں میں
ایکسرے سے تیز لیزر کا رمادہ بھر کے
نیندیں سلب کر لی تھیں
جدھر بھی دیکھتی اب وہ
اسے جسموں کے اندر کی غلاظت اور کثافت ہی نظر آتی
غدود اور تلیاں اور پھیپھڑے
اور کھد بداتے، ہانپتے اعضاء
دماغی لوتھڑے اور جھلیاں اور ان میں منصوبوں کے امکانات
چکناہٹ، رطوبت، بجلیاں اور خون کے اندر سفیدی کے تلاطم
بے وفائی، مکر اور دھوکے کے میلانات
سب اس پر ہویدا تھا
کچھ ایسا سحر تھا اُس پر
گُرو کے پاؤں میں اک عمر رہ کر بھی
تماشہ گاہِ دنیا پر تبسم کا ہنر اس کو نہ آیا تھا
سو اُس نے جاگتے میں خواب بُننے کا عمل سیکھا
یہاں سب شانتی تھی
تتلیاں تھیں، پھول تھے، جگنو تھے، تارے تھے
ہر اک جھونکے میں خوشبو تھی

کہیں خوابوں کی دنیا سے ادھر
فردا کے جنگل میں
کوئی گھوڑے پہ بیٹھا شاہزادہ دھند سے لڑتا ہوا آتا تھا
جس کے ہر قدم سے
قربتِ منزل نمایاں تھی......
مگر یہ خواب کا ماحول
کچھ ساعت ہی چلتا
اور اس کے بعد
دلدل، دشت اور اونچی فصیلیں
محل کے کنگرے
حفاظت پر مقرر دیو قامت جن
اور انسانوں کی کھالوں میں بندھے
مکروہ پیکر
پھر ابھر جاتے
زباں پر شکوۂ ماحول کے کانٹے نکل آتے......
سُنا ہے شاہزادی
آخرش
جادو کی اس نگری سے چھٹ کر جا رہی ہے
''نہ کوئی چاند وعدے کا

نہ کوئی ریشمی رستہ
تمنا کے نشیبوں میں
ادھورے پھول کھلتے ہیں"
مگر پھر بھی
اُسے آگے نکلنا ہے
"کسی انجان وادی کی کسی بے نام کٹیا میں
اسے منزل بلاتی ہے
اُسے رخصت کرو
پہچان کے گمبھیر رستوں کی مسافت پر
اسے رخصت کرو۔"

○

اعجاز الحسن

مصوّر ہو یا تم عطّار ہو کوئی
جو تصویرِ لبِ گُل سے
کشیدِ حسن کرتا ہے
درختوں کے تنوں پر چڑھتی بیلوں سے
وہ خوشبو کاشت ہوتی ہے
جو سانسوں ہی نہیں
آنکھوں میں بھی
پُر کیف احساس اور تصور خیز تعبیریں اگاتی ہے

گُلِ تازہ

جو برگِ دیو پیکر کے تناظر میں
لچکتی شاخ پر روشن، برہنہ تن کھڑے ہیں
دادِ نظارہ کے طالب ہیں
یہ کیا وہ صورتیں ہیں جو
ابھی تک
خاک میں پنہاں پڑی تھیں
اب گُل و لالہ کی صورت
پھر نمایاں ہوگئی ہیں
یا ہمارے خواب ہیں
اک عہدِ فردا کے
یا وعدے ہیں کسی خوشحال دنیا کے......
سراپا حسن و رعنائی
مجسم چشمۂ خوبی
تمناؤں کے کینوس پر
گُلِ پروردۂ فطرت کی معصومی
گھنے پتوں کے ٹھنڈے سائباں میں
آسماں کے چھید
جن میں کل کے

میرے آنے والے کل کے پوشیدہ اشارے ہیں
سحر کے استعارے ہیں

مصور......اے مرے حساس دل ساحر
کبھی اک نالہ وشیون
کبھی اک چیخ تم سے بھی نکل جاتی ہے
پھر بھی تم محبت سے ہمیں امید کی صورت دکھاتے ہو
نہ جانے تم میانِ برگ وگُل
اس عہد کی ناکامیاں کیسے چھپاتے ہو!!!

نقش بر قالین

رخِ نیلوفر کی مصوری سے متاثر ہو کر

اسے بھی دیکھو
ہر ایک گھر میں جو سطحِ قالین پر منقش
حسین عورت ہے
سانس روکے
جو مٹتی، بنتی شبیہہ بن کر
جزیرۂ وقت کے انوکھے
رنگین پیٹرن میں چھپ رہی ہے
مگر عیاں ہے

یہ ایک انساں نہیں ہیولا ہے، نقش ہے
نقشِ زیر پا ہے
جو گم نہیں ہو سکا زمیں پر
اماں نہیں پا سکا کہیں پر
کہیں پسِ برگ مٹ گیا ہے
کہیں سرِ راہ کھل گیا ہے
سیاہ ملبوس کی تہوں میں برستی آنکھوں تلک ڈھکا ہے
یا زرد پھولوں میں سرخ شاخوں میں چھپ گیا ہے
یہ ایک عورت
دمِ ازل سے
کسی کی ہمدم، کسی کی ساتھی، کسی کی محبوب بن کے جینے کی
جس سے امید چھن گئی ہے
غلامِ بے دام ہے جو دن میں
ہر ایک شب جو بنا محبت
چتا کے بستر میں لیٹتی ہے
کسے خبر اس کے دل کے نزدیک، سوچ مرکز میں
کیسے سیال کھولتے ہیں
کسے خبر
اس کے زرد چہرے پہ خواب آنکھوں میں کتنے آتش فشاں چھپے ہیں

اسے بھی دیکھو
تمہارے زیبائشی گھرانے کے سات رنگے سپاٹ پیٹرن سے جب یہ نکلی
تو اس کے پیکر میں تیسری جہت آملے گی
یہ خود کو انسان مان لے گی
تو پھر اسے قیدِ رنگ و صورت میں ڈھالنے کی
نہ کوئی ترکیب ہو سکے گی
نہ کوئی رستہ نکل سکے گا
نہ کوئی قالین
اس کو واپس نگل سکے گا......!!

○

غزل

محبت سے تری یادیں جگا کر سو رہا ہوں
میں آدھی رات کو خوشبو لگا کر سو رہا ہوں

سنا ہے جب سے، تُو نے رات آنکھوں میں بسر کی
میں بستر کی جگہ کانٹے بچھا کر سو رہا ہوں

میں دریا ہوں مری گہرائی پوشیدہ ہے مجھ میں
گرفتِ خاک سے دامن چھڑا کر سو رہا ہوں

وہ گھر میں ہے مگر کہتا ہے کوئی گھر نہیں ہے
تو میں بھی آج ویرانے میں جا کر سو رہا ہوں

نہیں ہے دسترس میں اب زمیں کا کوئی ٹکڑا
سو میں کاغذ پہ اپنا گھر بنا کر سو رہا ہوں

وہ خواہش جس کو سینے سے ابھی لپٹا رہا تھا
اُسی کو اپنے پہلو سے ہٹا کر سو رہا ہوں

غزل

دیکھنا جب دار سے عیسیٰ اتارا جائے گا
جسم اس کا خود بخود اوپر کو اٹھتا جائے گا

کون کہہ سکتا تھا کیلیں جس ہتھیلی پر گڑیں
سارے عالم کا مقدر اس پہ لکھا جائے گا

کن سروں کو اپنے نیزوں پر اٹھا کر لائے ہو
اب گلی کوچوں میں یہ سارا تماشا جائے گا

اب کے اس شدت کا حملہ ہے عقب کی سمت سے
وار روکو گے تو دانتوں میں لہو آجائے گا

جگنوؤں کے راستے پر عمر بھر آنکھیں بچھائیں
جانے کیا تدبیر کرنے سے اندھیرا جائے گا

گرم ہونے دو ہوا، جب دائرہ پورا ہُوا
پھر چمن کی فکر میں بارش کا جھونکا جائے گا

اپنے اوپر خود ہی عائد کر رہے ہو فردِ عشق
چپ رہو جب کوئی پوچھے گا تو دیکھا جائے گا

ہم سبک سر ہی سہی محرومِ جوہر ہی سہی
کیا ہمیں اب کاغذوں کے ساتھ تولا جائے گا

○

غزل

اب کے موضوع بدلنا ہوگا
کانچ کے فرش پہ چلنا ہوگا

چاند ڈلیوں کے ورق بنوالوں
ناامیدی کو بہلنا ہوگا

یہ جو سورج نہیں ڈوبا اب تک
اب اسے شعر میں ڈھلنا ہوگا

شام کی راہ کا گل رنگ غبار
صبح کے ہاتھ پہ ملنا ہوگا

کھُلتا جاتا ہے گریبان فلک
شاید اب چاند نکلنا ہوگا

روشنی کھانے لگے ہیں رہبر
پہلے مصرعے کو بدلنا ہوگا

نیند پھر روٹھ گئی آنکھوں سے
خواب کو دھوپ میں جلنا ہوگا

○

آخری تصویر

بچپن سے میں
ہر کاغذ پر
سورج کھینچا کرتا تھا......
ایک جھونپڑا
ایک سڑک
اک آسمان
اور کچھ ہریالی......

عمر کا آخر آپہنچا ہے
سورج، رستہ، گھر، ہریالی
سب کچھ ہے
پر اس تصویر میں
تم بھی نہیں ہو
میں بھی نہیں ہوں!

غزل

مرے آئینے کو عزیز رکھ، تنِ ریزہ ریزہ قبول کر
مرے ضبطِ گریہ کی داد دے، مری بندگی کو وصول کر

تو ہے سب سے بڑھ کے غنی اگر، تو غریب پروری کر کبھی
کہ سیاہ خانہ ہے دل مرا، مری انجمن میں نزول کر

مرے حوصلے میں سکت کہاں، ترا امتحان اٹھا سکے
جسے کل سنبھالا بھی جا سکے، مرے دل کو اتنا ملول کر

رگِ جاں سے گرچہ قریں رہا، مرا تیرا ساتھ نہیں رہا
مرا دل کہ ہے صنم آشنا، اسے آشنائے رسولؐ کر

کوئی اختیار بچا نہیں، مرے دل میں کچھ بھی مِرا نہیں
میں سفیرِ کوچۂ عشق ہوں، مجھے اپنے پاؤں کی دھول کر

مجھے اوجِ عرش سے توڑ کر، تُو ملا چکا ہے زمین میں
کبھی یہ بھی ہو، اسی خاک کو، جو گُلِ ریاضِ بتولؓ کر

جسے خاک برسری مل گئی، اسے سرفرازی نہیں چاہیے
اسی کاروبارِ حیات میں، مجھے وقفِ شوقِ فضول کر

یہ مری دعا ہے سدا رہے، ترا راستہ، مرا راستہ
تجھے بھولنے کا گمان بھی، کبھی جی میں آئے نہ بھول کر

غزل

شاخِ ہوا کے ساتھ لرزتا، پھر وہی رستہ
منزل کی جانب سے ہٹتا، پھر وہی رستہ

چاند ستاروں تک جانے کی پھر وہی خواہش
بادل کے پیروں سے لپٹا، پھر وہی رستہ

ویسا ہی اک اجنبی گاؤں، پہلے جیسا
کاجل کی رنگت میں ڈوبا، پھر وہی رستہ

وہی زمانہ، وہی محبت، وہی کہانی
پھر وہی آنسو، پھر وہی وعدہ، پھر وہی رستہ

میرے ہاتھ میں بھاری بھرکم پتھر کے سِل
کوہِ ندا سے واپس آتا، پھر وہی رستہ

بل کھاتی اور شور مچاتی، پھر وہی ندیا
ساتھ ساتھ خاموش گزرتا، پھر وہی رستہ

اک بے رس معمول میں جکڑے ہوئے مسافر
شام سویرے پھر وہی رستہ، پھر وہی رستہ

○

غزل

سورج تری دہلیز میں اٹکا ہوا نکلا
یہ نقرئی سکہ کہاں پھینکا ہوا نکلا

ہم نے کبھی کھینچا تھا جو انگلی سے ہوا پر
وہ نقش تو دیوار پہ لکھا ہوا نکلا

شام اپنے طلسمات میں جکڑی ہوئی آئی
چاند اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا نکلا

وہ حشر ہوا ہے کہ ترے حشر کا منظر
پہلے سے کئی مرتبہ دیکھا ہوا نکلا

اک یاد مرے ذہن میں بجھتی ہوئی آئی
اک چاند مرے کھیت سے ٹوٹا ہوا نکلا

للکارا اندھیرے نے کہ خورشید کہاں ہے
اک دیپ کہیں اوٹ سے سہما ہوا نکلا

○

غزل

مصرعے کے وسط میں کھڑا ہوں
شاید میں اندھا ہوگیا ہوں

سوئے ہوئے بیج جاگ جائیں
کھیتوں میں اشک بو رہا ہوں

دہلیز کے پاس سے کسی کے
پھینکے ہوئے خواب چن رہا ہوں

بستر میں رات سو رہی ہے
میں تیرے حضور جاگتا ہوں

ساری مردہ محبتوں کو
حیرت سے چھو کے دیکھتا ہوں

ٹوٹی ہوئی رقم کی طرح سے
بیکار میں خرچ ہوگیا ہوں

بھولا ہوں سمندروں پہ چلنا
گلیوں میں ڈوبنے لگا ہوں

تلوار پر نقش کھود کر کیا
قاتل سے داد چاہتا ہوں

بہروپ بدل لیا ہے تو نے
میں بھی تو تماشا بن گیا ہوں

○

غزل

نقوشِ پا ، لکیریں ، زاویے ، اچھے نہیں لگتے
سنا ہے آسماں کو راستے اچھے نہیں لگتے

فلک پر پھیل جائیں، تیرے آنچل پر بکھر جائیں
ستاروں کو منظّم سلسلے اچھے نہیں لگتے

تری تصویر کی پھر سے تلاوت کر رہا ہوں میں
بجھا کر طاق میں رکھے دیئے اچھے نہیں لگتے

بچھڑ جائیں تو بالکل ربط ہی باقی نہیں رہتا
مجھے وقفے کے یہ دورانیے اچھے نہیں لگتے

بُری ہیں میری تصویریں مگر ایمان سے کہہ دے
کہ تجھ کو لمس پرور دائرے اچھے نہیں لگتے

سحر ہوتے ہی جیسے ریت بھر جاتی ہے سانسوں میں
نسیمِ ہجر تیرے ذائقے اچھے نہیں لگتے

نظر آتا نہیں کچھ ، آئینہ اتنا قریب آیا
یہ میں نے کب کہا تھا فاصلے اچھے نہیں لگتے

سنا ہے شہر میں آیا ہے وہ اب مہرباں ہو کر
خبر اچھی ہے لیکن حاشیے اچھے نہیں لگتے

چمک بھی دے اگر آنسو دیئے ہیں آنکھ کو تو نے
مجھے چہرے پہ رکھے آبلے اچھے نہیں لگتے

○

انگیٹھی

آگ کو دیکھو
کیا وارفتہ رقص دکھائے!!
سوچ رہا ہوں
کون نہ دیوانہ ہو جائے
پلک جھپکتے جس کے تن کا
آبنوس
سونا بن جائے!

غزل

وہی آنکھوں میں پوشیدہ اشارے سے، وہی باتوں میں چوخانے معمّوں کے
گزرتے وقت نے اب تک نہیں بدلے، ہمارے شہر میں تیور حسینوں کے

رخِ خورشید ہو یا دامنِ مشعل، مرے گھر روشنی دو چار دن کی ہے
انہیں تو ایک دن بجھنا ہی بجھنا ہے، ہوا موجود ہے باطن میں شعلوں کے

سرابوں کی بدولت خود فریبی میں اکیلے دشت ایسے سر کیا میں نے
کہ جب نزدیک سے اوجھل ہوا پانی، نظر آنے لگے دھبے درختوں کے

بہار آتے ہی محوِ آئینہ ہونا، حسینوں اور پھولوں کی روایت تھی
یہ اہل درد کی صحبت میں سیکھے ہیں، گریباں چاک کر لینا قمیصوں کے

مکیں اس شہر کے، کوئی انہیں دیکھے، عجب خود ساختہ جیلوں میں رہتے ہیں
گھروں کے شہ دروں پر مستعد درباں، دریچوں پر گڑے پنجرے سلاخوں کے

کھلے صحرا میں اب ہر روز وہ آندھی ہے، ٹیلے آسماں پر اڑتے پھرتے ہیں
کبھی سوچا تھا میں نے گھر بنایا تو، بڑے ہوں گے دریچے اپنے کمروں کے

○

غزل

پھر یوں ہوا کہ گھر میں دھواں پھیلنے لگا
بالوں میں اپنے خاک گرانے لگی صبا

ھاتف نے ڈرتے ڈرتے کچھ ایسی خبر سنائی
دستِ فلک سے کوزۂ خورشید گر گیا

مٹھی بھنچی تو خواب کے ذرے بکھر گئے
رستہ کھلا تو درد کا طوفان چل پڑا

کہسار بھاگنے لگے بادل سمیٹ کر
پانی زمیں کی قید سے آزاد ہوگیا

چھاؤں میں بیٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا
امکان کا درخت زمیں بوس ہوگیا

پتھر کی پالکی میں ستارا سوار تھا
پیروں میں چاند لیٹ گیا کانپتا ہوا

سایہ بھی برگِ سبز کا باقی نہیں جہاں
''حرماں تو دیکھ پھول بکھیرے تھی کل صبا''

دامن پہ پھول بھی نہ لہو سے بنا سکے
آنکھوں پہ اختیار ہی باقی نہیں رہا

کرتار کوئی اور تھا کردار کوئی اور
اب کوئی کیا بتائے یہاں کس نے کیا کیا

ہر کشتۂ ستم کو تسلی اسی کی ہے
رسم و رہِ جہاں تری ڈھارس کا شکریہ

ہم ہو چکے ہیں ، ہم کو بدلنا محال ہے
بدلا کہاں گیا ہے جو اکبار ہو چکا

غزل

کسی پہلے سے بتائے ہوئے رستے پہ چلوں
میں سگِ خانہ نہیں ہوں کہ اشارے پہ چلوں

کیوں خس و خاک بنوں، وقت کے دھارے پہ چلوں
اپنی تقلید کروں، اپنے ستارے پہ چلوں

دیکھ آیا ہوں خدو خال کے بازار بہت
پھر اسی شوخ کے دیکھے ہوئے چہرے پہ چلوں

نہیں قسمت میں اگر دوشِ صبا پر رہنا
خشک پتے کی طرح گرد کے جھونکے پہ چلوں

جب بھی اٹھے، تری آنکھوں پہ ہی رک جائے نظر
یہ تمنا ہے کہ اس جھیل کنارے پہ چلوں

میری سن لے، مجھے ہمراہ بنا لے اپنا
تیرے رستے میں کھلے زخم کے تلوے پہ چلوں

○

غزل

افسوس غمِ یار سے مہلت مجھے تھی
دنیا میں الجھ جانے کی فرصت مجھے تھی

جو کچھ بھی ملا میرے لیے فالتو تھا
وہ مل نہ سکا جس کی ضرورت مجھے تھی

وہ طرزِ تغافل بھی خدا جیسا تھا
اب دیکھیے، لازم تو عبادت مجھے تھی

چاہت میں کوئی خود کو کہاں دیکھتا ہے
نابینا سہی چاند کی حسرت مجھے تھی

جس شخص کے بارے میں کبھی سوچا نہیں
اب سوچتا ہوں اس سے محبت مجھے تھی

آئینہ در آئینہ تھا بکھرا ہوا میں
تیری طرح وحدت میں ہی کثرت مجھے تھی

مجھ سے کبھی احکام نہیں مانے گئے
انکار ہی کرنے کی طبیعت مجھے تھی

رقعہ پہ نہیں آنکھ کی تصویر بنائی
ہر چند کہ دیدار کی حسرت مجھے تھی

○

ہیں خواب میں ہنوز ......

یہ روز و شب کہاں جاتے ہیں
کس دنیا میں زندہ ہیں......
یہ ہم جو چند لمحے پیشتر محفل میں
اپنے دوستوں کے درمیاں خوش باش بیٹھے تھے
وہ منظر اب کہاں ہے
کس جگہ ہو گا؟
یہ سب انسان کیوں بزمِ طرب کو چھوڑ کر
اپنے حزیں خانوں میں لوٹ آئے......

ہر اک گذرا ہوا منظر
ابھی تک کیمرے کی آنکھ میں زندہ ہے
بجھتی یاد میں باقی ہیں
اور ایتھر کی لہروں میں کہیں موجود ہے
لیکن اگر تبدیل کرنے کے ارادے سے
اسے چھو کر کبھی دیکھا
تو اس کی راکھ اُڑ کر پھیل جائے گی
مگر جو لمحۂ موجود
پانی کی طرح بہتا ہے
مٹھی میں کہیں رکتا نہیں
وہ کیا کہیں پر ہے بھی یا ہر آنے والے پل
کے اک موہوم اندازے میں
اور ماضی کی یادِ کار کے مابین
اک موہوم مفروضہ ہے......
یہ دنیا ہے یا
بس ہونے کا دھوکہ ہے!

غزل

غزل کو مسترد دیکھا، سخن کو بے اثر پایا
نئے انسان کو رنگِ نوا سے بے خبر پایا

نہ جانے کیوں بنائیں اس نے لاتعداد دنیائیں
پکارا جب اُسے، حالِ جہاں سے بے خبر پایا

درختوں کی طرح خود کو لٹانا کس کو آتا ہے
جسے دیکھا اُسے دادِ جفا میں بے ہُنر پایا

تُو جب آئے میں اس ڈھلوان پر ہوں منتظر تیرا
کھڑا ہونگا اگر میں اپنے پیروں پر ٹھہر پایا

مجھے تیری زمیں نے اپنی جانب کھینچ رکھا ہے
اب اتنے بوجھ میں کس نے جہانِ بال و پر پایا

وہاں جانے میں کتنے لاکھ شمسی سال لگتے ہیں
کہاں ہونگا میں جب تک آہ نے میری اثر پایا

ہمیشہ لمحۂ موجود میں موجود ہے دُنیا
ہر اک آتے ہوئے لمحے کو اپنا ہمسفر پایا

○

محبت کی سمجھ مشکل سے آتی ہے

محبت کی سمجھ مشکل سے آتی ہے
ہم اپنی خواہشوں کو
چاہتوں کو
پیاس کو
اکثر محبت ہی سمجھتے ہیں
مگر جب پیاس بجھ جائے
تو پھر پیالے میں پانی ہو، کہ خالی ہو
برابر ہے

طلب ہوگی تو پھر اک جستجو کا سلسلہ ہوگا
جنوں محوِ سفر ہوگا ......
کسی محبوب شے کو دیکھنے، چھونے، اٹھالینے
(کچلنے، توڑنے، اس کو فنا کرنے) کی حسرت
کیا محبت ہے؟
کسی ذی روح کو
اپنا تسلط زاد کرنا
پالنا، پچکارنا، محکوم کرنا
کیا محبت ہے؟
محبت ذات کی پہچان
جینے کی تمنا ہے
بقا کا ذوق جب آزاد ہوتا ہے
تو پھولوں، خوشبوؤں، چہروں، ہواؤں، منظروں
سارے جہانوں تک بکھر کر پھیل جاتا ہے
محبت زندگی ہے
روحِ اول ہے
یہ رشتوں تک نہیں محدود ہو سکتی
یہ تجھ تک رک نہیں سکتی
یہ مجھ تک تھم نہیں سکتی

اسے تو پھیلنا ہے اور بکھرنا ہے
اسے ہر چیز کو چھو کر گزرنا ہے
اسے آزاد رہنا ہے......
یہ پہلا جذبۂ تخلیق ہے
جس نے جہاں پیدا کیا تھا
جو ازل بھی ہے
ابد بھی ہے
اور اس سے ماوراء بھی ہے
مجھے تو ایسا لگتا ہے
محبت ہی
خدا بھی ہے!!

غزل

رکتے رکتے جنوں ہوگیا
یہ نہ پوچھو، کہ کیوں ہوگیا

ایک پہرا ہے چاروں طرف
یہ تو پورا فسوں ہوگیا

ہم پلک بھی نہ جھپکا سکے
جو نہ ہونا تھا، یوں ہوگیا

تیرے ملنے کی صورت گئی
کیسا دل میں سکوں ہوگیا

میرے ہاتھوں حقیقت کے گھر
آرزوؤں کا خوں ہوگیا

آسماں پر ستارا مرا
اور میں خوار و زبوں ہوگیا

عکس کو آنکھ میں دیکھ کر
آئینہ سرنگوں ہوگیا

○

غزل

ترے خیال میں بیٹھوں تو کچھ سمجھ آئے
درونِ آئینہ دیکھوں تو کچھ سمجھ آئے

ہزار تسمے بندھے ہیں تری نگاہوں میں
کسی سوال کو کھولوں تو کچھ سمجھ آئے

ہے اپنے ہونے کا پیچیدہ راستہ درپیش
اب اس مقام سے گزروں تو کچھ سمجھ آئے

وہ مجھ میں ہو کے بھی کیسے چھپا رہا مجھ سے
گر اپنی ذات کو سمجھوں تو کچھ سمجھ آئے

اچانک اس پہ بنے عکس چل پڑے کیسے
میں تیرا آئینہ دیکھوں تو کچھ سمجھ آئے

میں خواہشوں کے تعاقب میں آ گیا ہوں کہاں
جو یہ سراب سمیٹوں تو کچھ سمجھ آئے

تو ہر طرف ہے تو پھر کیوں نظر نہیں آتا
انا کا بوجھ اتاروں تو کچھ سمجھ آئے

حیات کیا ہے ، اسے کس طرح گزارنا ہے
کسی فقیر سے پوچھوں تو کچھ سمجھ آئے

کہ جیسے نیند کو کوشش سے لا نہیں سکتے
سمجھ کا راستہ چھوڑوں تو کچھ سمجھ آئے

ترے مقام کو دیکھوں تو کچھ دکھائی دے
ترے حضور میں پہنچوں تو کچھ سمجھ آئے

محبت کیا ہے

محبت ایسی ہوتی ہے
کہ جیسے باغ میں آڑو کے پھولوں سے بھری جھاڑی
کہ جیسے رات کی رانی کی خوشبو
آٹھویں کا ٹوٹا پھوٹا چاند
دل کا درد
غالب کی غزل
خسرو کی قوالی
ہوا کے دوش پر اڑتے ہوئے پتے

کہ جیسے ریل گاڑی کی دھمک، جب وہ قریب آئے
کہ جیسے گھاس پر شبنم زمرد رنگ کر جائے

محبت ایسی ہوتی ہے
کہ جیسے آنکھ میں ٹھہرا ہوا آنسو
کتابوں کی مہک
اشعار کی تاثیر
جیسے ذائقہ پانی کا
گل کا لمس
جیسے مور کا رقصِ تمنا
دشت میں چونکا ہوا آہو
کسی کی یاد میں ڈوبا ہوا لمحہ
کسی ڈبیہ میں سنگوایا ہوا بوسہ

محبت ایسی ہوتی ہے
کہ جیسے سنگ ریزوں سے شجر چھوٹیں
لہو کی آگ سے چنگاریاں پھوٹیں
فضا میں جس طرح خوشبو ٹھہر جائے
سرابوں میں چلے کشتی
کوئی گم کردہ راہی راستہ پائے

کوئی بچہ ہنسے
پائل بجے
پہلو میں دل اچھلے
کہ جیسے ہاتھ میں چھالا نکل آئے
کہ جیسے موت کی تاریخ مل جائے
محبت ایسی ہوتی ہے

○

غزل

دل نہ ملتے ہوں تو پھر عید یا بقر عید بھی کیا
حسرتِ دید بھی کیا، کاوشِ تجدید بھی کیا

یاد کے طاقچے خالی ہیں چراغوں سے مرے
دل کی دیوار سے اُڑ جائے گی امید بھی کیا

جب ترا دستِ حنائی نہیں رہنے والا
پھر مرے ہاتھ یہ مہتاب یہ خورشید بھی کیا

لب کی شیرینی چکھی آنکھ کا دھوکہ کھایا؟
یار سے وصل کی باندھی نہیں تمہید بھی کیا

جو بناتا ہوں وہی تیرا سراپا ہوجائے
مٹ گئی چہرۂ تصویر سے تجرید بھی کیا

میرے خوش فہم محبت کو عبادت نہ سمجھ
اس قدر بات کو دہرانے کی تاکید بھی کیا

غزل

مجھے لکھنا نہیں آتا، تمہیں پڑھنا نہیں آتا
تمہیں سننا نہیں ہے اور مجھے کہنا نہیں آتا

نہ جانے گاؤں سے کیوں شہر میں لے آئے ہو مجھ کو
یہاں سب بھاگتے ہیں اور مجھے چلنا نہیں آتا

مرے آنسو نہیں رکتے کسی فرضی کہانی پر
مگر سچے حوادث پر مجھے رونا نہیں آتا

ثمر لگتے تو ہیں ، پکتے نہیں ہیں نیچی شاخوں پر
یہاں وہ بار آور ہے جسے جھکنا نہیں آتا

وہ تُو ہو، وصل کا موسم ہو، یا گزرا ہوا لمحہ
میں اس کا منتظر کیوں ہوں جسے آنا نہیں آتا

○

زین کے لیے

تین......
تین ہی سال ہوئے ہیں
یعنی ایک ہزار پچانوے دن......
روشنی کے جانے کے بعد یہ کالے لمحے
کیسے گزرے
جب سے تم گزرے ہو
بے دردی سے
چھینے گئے ہو

کتنے ادھورے خواب

کہانیاں

ہنسی

محبت

اور ہزاروں کام چھوڑ کر

جواب تک باقی ہیں......

جھوٹ ہے وقت علاج کرے گا

وقت کے ساتھ

یہ زخم تو اور بھی گہرا

اور بھی گہرا ہوا

بڑھتا گیا کچھ اور بھی

جب یہ درد لگا ہے ٹھہرا ہوا......

کب تک یہ سب سہنا ہے......

جانے کب تک

دنیا میں

ایسے ہی ہوتے رہنا ہے......

○

غزل

شکستِ شیشۂ دل کی دوا میں کیا کرتا
ترے علاوہ کوئی دوسرا میں کیا کرتا

میں غوطہ زن تھا تری یاد کے سمندر میں
لباس اٹھا کے کوئی لے گیا میں کیا کرتا

کسی کے جام کی جھوٹی شراب کیوں پیتا
تمہارے حسن کی قاتل ادا میں کیا کرتا

میں جب چلا مری منزل بھی چل پڑی آگے
ہمارا کم نہ ہوا فاصلہ، میں کیا کرتا

ہر ایک چیز اگر تیرے اختیار میں ہے
تو میں نے ہونے دیا جو ہوا ، میں کیا کرتا

حیاتِ نو کے جزیرے پہ روکنی پڑی ناؤ
مخالفت پہ تلی تھی ہوا میں کیا کرتا

مری سرشت میں انکار رکھ دیا تونے
تو حکم مانتا کیسے، بھلا میں کیا کرتا

یہ دل تو ایک زمانے سے انتظار میں تھا
تُو آکے بیٹھتا پھر دیکھتا میں کیا کرتا

مرا تو جو بھی تھا سب کچھ ترا دیا ہوا تھا
مرے کریم ترا شکریہ میں کیا کرتا

○

غزل

اُسے سر کرنے کا سودا تھا، محبت کسے تھی
نارسائی یہ بتا ، عشق کی جرأت کسے تھی

بند تھے ہم پہ تری لطف و عنایات کے در
پھر بھی تُو سامنے رہتا تو شکایت کسے تھی

کہیں میں ہی تو نہیں ترکِ تعلق کا سبب
فائدہ کس کا تھا، تنہائی کی حاجت کسے تھی

کس نے لوٹی ہے ترے دل سے متاعِ امید
بے اجازت چلے آنے کی اجازت کسے تھی

خاک چاٹی ہے تو تلوار چلانی آئی
ورنہ میدان میں حق گوئی کی جرأت کسے تھی

آنکھ میں اٹکا ہوا چاند تھا کاجل سے بھرا
رات کیوں گزری، اجالوں کی ضرورت کسے تھی

پھول سے تیرتے رہتے تھے ترے لہجے میں
جز ترے قربِ لب، اور یہ دولت کسے تھی

تجھے پہچانا تو توڑے نہیں پھر لات و منات
تو نہیں تھا تو یہ نیرنگیٔ وحدت کسے تھی!

○

املتاس

یہ کارِتخم ریزی کیسا دلکش ہے
نہ جانے کتنی چاہت، کتنی حسرت سے
درخت اپنے تنِ بے رنگ باطن سے
یہ سونا کھینچ لاتے ہیں
یہ میرے کیمیا گر، اپنے سب فانوس، زیور، ٹہنیاں
پوری دوکانِ حسن لے کر راستے پر بیٹھ جاتے ہیں
کہ جیسے کوئی ماں بچے کو اپنی کوکھ میں لے کر
سرِ بازار آ جائے......

محبت سے لدے اشجار
آخر کار
کیسے اپنی پھلیوں سے لٹا کر بیج
اپنی زندگی قربان کر کے دیکھتے ہوں گے
کہ ان لاکھوں، کروڑوں، زندگی کے تازہ امکانات سے کوئی نیا پودا نہیں پھوٹا
سبھی رستے میں گر کر
پاؤں میں روندے گئے
جیسے کسی شاعر کے سپنے ہوں......

نہ جانے کیسی مٹی سے بنے ہیں یہ
انہیں مایوس ہونا ہی نہیں آتا
انہیں لٹنا تو آتا ہے
مگر رونا نہیں آتا......

○

پنجابی کافی

اج دِنے ویہڑے وچ، یاداں والا کھیس پا کے، دُکھاں دیاں مرچاں سُکان دے نی مائے
اکھیاں نوں سُوا رنگ چنگا بڑا لگدا اے، ایہدے نال دل پرچان دے نی مائے

میری بدنامیاں تے بیر بھری بیریاں نیں، بیریاں تے حق سب دا
کانہوں روکاں وٹیاں نوں، لہو والی مہندی مینوں سروچ چوکھی ساری پان دے نی مائے

سوچاں والی پیڑھی وچ، شگناں دے جوڑے نالے پیار دی رضائیاں جوڑ کے
میں تاں بوہے بیٹھی رہی، جنج کوئی آئی نئیں، ایتھوں مینوں ہن اٹھ جان دے نی مائے

بجھ گئے چراغ سارے، چن گُجھ مُجھ ہویا، خالی اے بنیرا شوق دا
ہجراں دے کالے سگ میرے اتے بھونکدے نئیں، لگدا اے مینوں اے سیان دے نی مائے

گُڑ تے گلاب لے کے، پیار دی کتاب لے کے، چلی ساں میں شعر بولدی
پلو میری چنر ی دا بدو بدی کھوء نئیں، جھلی توں اے ہنجو تے لکان دے نی مائے

موسماں دا گیہڑ کھا کے، بڑے ارمان نال، بی ءنوں ہوادے ہتھ بھیجدے نے رُکھ نی
کھنگری زمیناں وچ، خورے کتھے ٹور دّتے، چھیو ر سارے جیہڑے میرے ہان دے نی مائے

○

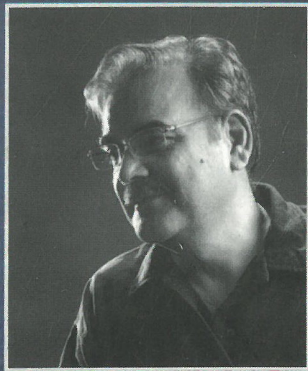

شاہنواز زیدی ایک ڈیزائنر، مصور، شاعر اور ہمہ جہت فنکار ہیں۔
آپ ایک عرصہ تک پنجاب یونیورسٹی کے کالج آف آرٹ اینڈ ڈیزائن کے سربراہ رہے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی شاعری کی دو کتابیں 'آئینہ دار' اور ٹیگور کی شاعری کا منظوم ترجمہ 'گیتا نجلی' شائع ہو چکا ہے۔

۱۹۹۸ میں حکومتِ پاکستان نے آپ کو مصوری میں تمغۂ امتیاز سے نوازا اور ۲۰۱۳ میں تمغۂ حسنِ کارکردگی دیا گیا ہے۔

شاہنواز لاہور میں رہتے ہیں اور آجکل کامسیٹ یونیورسٹی میں بطورِ ایڈوائزر کام کر رہے ہیں۔

email: shahnawazz@hotmail.com
szaidi@ciitlahore.edu.pk